نکات الشعرا

میر تقی میر

مترجم

حمیدہ خاتون

ایم۔ اے (فارسی)

تذکرہ
نِکات الشعراء

از

میر تقی میرؔ

مترجم

حمیدہ خاتون

ایم۔ اے (فارسی)

۶۴۔ اے، پاکٹ اے ۱۰، کالکاجی ایکس ٹینشن
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

نام کتاب ———— تذکرہ نِکات الشعراء
سنِ اشاعت ———— ۱۹۹۴ء
تعداد ———— چھ سو
ناشر ———— حمیدہ خاتون
مطبع ———— جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرس دہلی
قیمت ———— پچاس روپے

یہ کتاب دھلی اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی

Title : Tazkira Nikat-ush-shoara
Translated By : Hamida Khatoon
M. A (Persian)
Price : Rs 50/=

:- ملنے کے پتے :-

- حمیدہ خاتون، ۶۴ اے، پاکٹ اے ۱۰ کالکاجی ایکس ٹینشن نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹
- سیمانت پرکاشن، کوچہ روہیلہ، دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل والی، کوچہ پنڈت، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶
- انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر راؤز ایونیو نئی دہلی۔

والدہ مرحومہ

سعیدہ خاتون

کے نام

کہ جن کے شوقِ علم نے مجھے یونیورسٹی کی تعلیم کی توفیق

عطا کی!

حمیدہ خاتون

ترتیب

اظہارِ تشکّر ______ ۶

مقدمہ مترجم ______ ۷

فہرست شعراء ______ ۱۱

مقدمہ مصنف ______ ۱۴

خاتمہ ______ ۱۵۹

ترقیمہ ______ ۱۶۰

اظہارِ تشکّر

میں اس ترجمہ کی تیاری میں بہت سے لوگوں کی شکرگزار ہوں۔ اُستاد محترم پروفیسر عبدالودود اظہر نے کئی بار میری مشکلات کو حل کیا، میں ان کی شکرگزار ہوں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے پیش لفظ کے لیے ضروری مطبوعہ مواد فراہم کیا، ان کی ممنون ہوں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے ازرہِ عنایت ترجمہ کی بعض فروگزاشت کی نشاندہی کی اور نمونہ کلام کے بعض اشعار کی درستی کی اور اپنے قیمتی وقت کا ایک معتدبہ حصہ اس کی اصلاح پر صَرف کیا، میں ان کی ممنون ہوں۔ جناب انوار رضوی کی ممنون ہوں کہ ان کی ہی تحریک اور ہمت افزائی پر میں نے اس کام کو شروع کیا اور پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اپنے شوہر عبدالخالق صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی میں ضروری سمجھتی ہوں کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ کام ہرگز مکمل نہ ہوتا عربی لفظوں اور جستہ جستہ عربی فقروں کی گرہ کشائی بھی بیشتر ان ہی کی عربی دانی کی رہینِ منّت ہے۔ جناب اکبر عرشی زادہ کا شکریہ ادا نہ کرنا زیادتی ہوگی کیوں کہ انھوں نے میری درخواست پر رضا لائبریری، رامپور کے نسخہ کی ایک کاپی فراہم کی جس سے کام کا آغاز ہوا۔ اور آخر میں جناب زبیر رضوی سیکریٹری اور جناب راغب الدین پروگرامر دہلی اردو اکاڈمی کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جن کی پُرخلوص توجہ اور خصوصی تعاون کے بغیر یہ مسودہ کتاب نہ بن پاتا۔

حمیدہ خاتون

مقدمہ مترجم

میر تقی میرؔ اردو کے پہلے عظیم شاعر ہیں، اُن کو خدائے سخن بھی کہا گیا ہے۔ میرؔ صاحب نے نہ صرف یہ کہ اردو کے جملہ شعری اصناف میں طبع آزمائی کی بلکہ ان کے واضح خدوخال بھی متعین کیے۔ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیت کے بل پر اردو میں نئے نئے اسالیب شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ غزل کو خاص طور پر نہایت بلند درجہ پر پہنچایا۔ اس تمام کے ساتھ جو سب سے بڑا کام کیا وہ اردو میں شاعری کی زبان کی تشکیل کا کام تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کارہائے عظیم میں مرزا رفیع سوداؔ اور بعض دوسروں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا لیکن میرؔ صاحب یقیناً میرِ کارواں ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میرؔ نہ ہوتے تو غالبؔ بھی نہ ہوتے۔ بعد کے شعرا نے جو شاعری کے لیے زبان کا ہموار اور بنا بنایا راستہ پایا وہ میرؔ صاحب کی ہی محنتوں اور صلاحیتوں کا ثمرہ تھا۔ میر تقی میرؔ نے شاعری میں آٹھ دواوین چھوڑے ہیں اور شاعری کی کسی صنف کو نہیں چھوڑا اور ہر صنف میں جم کر اور خوب تر کہا۔

میرؔ صاحب نے نثر میں تین کتابیں تصنیف کی تھیں: "تذکرہ نکات الشعرا"، ذکرِ میر، اور فیضِ میرؔ۔ یہ تینوں کتابیں اُس زمانے کے رواج کے مطابق فارسی میں لکھیں۔ "تذکرہ نکات الشعرا" کا سنِ تصنیف ہجری کے مطابق ۱۱۶۵ھ قرار پایا ہے۔ یہ اس کی تکمیل کا سال ہے۔ غالباً یہ ۱۱۶۱ھ میں شروع کی گئی تھی۔ سورت، گجرات کے ایک ذی علم اور نامور شاعر سید عبدالولی عزلت دہلی آئے تھے اور میر تقی میرؔ کی اپنی شہادت کے مطابق یہ تصنیف انھیں کی فرمائش پر کی گئی تھی۔ میرؔ صاحب کی عمر اس وقت ہجری سن کے مطابق تیس سال تھی۔ عیسوی حساب سے یہ عمر ایک سال اور کم ہو جائے گی۔

انھوں نے خود کو اکبرآباد کا باشندہ اور شاہ جہاں آباد دہلی میں تازہ وارد لکھا ہے یعنی کچھ مدت پہلے ہی وہ دہلی ترک وطن کرکے آئے تھے۔

"تذکرہ نکات الشعرا" میں ۱۰۴ شعرا کا ذکر لکھا گیا ہے جن میں بتّیس شعرائے دکن ہیں۔ میر صاحب دکن کے اردو شعرا سے ذرا بھی خوش نہیں ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ ان میں ایک بھی مربوط شاعر نہیں ہے اور ان کا تذکرہ بھی ان کو ملول کرتا ہے۔ دراصل دکن کے شعرا سے ان کی واقفیت کا تمام دارومدار سید عبدالولی عزلت کی ڈائری پر تھا جن میں بعض شعرا کے نمونہ کلام تخلص کے ساتھ درج تھے۔ میر صاحب نے جوں کا توں ان کو نقل کر دیا ہے۔ ظاہر ہے اس انتخاب ہیں سے انتخاب البتہ میر صاحب کا ہے۔ ذرائع نقل وحمل کی کمی یا تقریباً عدم کے باعث دکن کے شاعروں کا احوال اور کیفیت شمال میں مفقود تھے۔ اس لیے نکات الشعرا میں بلا وجہ شعرائے دکن کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے۔

میر صاحب نے اپنے پیش لفظ میں دعویٰ کیا ہے کہ نکات الشعرا اردو کے شاعروں کا پہلا تذکرہ ہے۔ بعد کی تحقیق کے مطابق ان کا دعوے حق بجانب قرار دیا گیا ہے گو کہ یہی وہ زمانہ ہے کہ جب مخزن نکات مولفہ قائم، تذکرہ ریختہ گویاں مولفہ گردیزی اور گلشن گفتار مولفہ حمید اورنگ آبادی بھی لکھے جا رہے تھے مگر سب سے پہلے تکمیل کو پہنچنے والا "تذکرہ نکات الشعرا" ہی ہے۔ یہ تذکرہ لکھتے ہوئے میر صاحب کے سامنے کوئی نمونہ نہیں تھا۔ فارسی شعرا کے تذکرے البتہ وجود میں آچکے تھے۔ میر صاحب کی اختراعی طبیعت نے نکات الشعرا کا بیش بہا تحفہ اردو دنیا کو پیش کیا اور اس کو علم پروری کے ایک نئے اسلوب سے آشنا کیا۔

نکات الشعرا معلومات کا خزانہ ہے۔ یہ میر صاحب کے عہد جوانی کی ایک یادگار دستاویز ہے۔ "آب حیات" میں مولانا محمد حسین آزاد نے جو میر تقی میر کا نقشہ کھینچا ہے وہ شاید میر صاحب کی محض کبر سنی کی شخصیت کو ہی بیان کرتا ہے۔ انھوں نے میر کو خشک مزاج، بددماغ اور خود بین لکھا ہے۔ نکات الشعرا

میں ہم اس سے بالکل مختلف میر کو دیکھتے ہیں۔ نکات الشعرا کا میر یار باش، زندہ دل، گپ شپ کرنے والا، میلے ٹھیلوں کا عاشق، عرس میں راتیں گزارنے والا، بزرگوں کا حد درجہ ادب واحترام کرنے والا، دوستوں پر جان چھڑکنے والا، مخالفین کے لیے بھی نرم گوشہ رکھنے والا اور ان کے ساتھ انصاف کرنے والا ہے۔ جیسے جیسے ہم نکات الشعرا پڑھتے جاتے ہیں میر صاحب کی شگفتہ اور زندہ دل شخصیت کے نقش ابھرتے جاتے ہیں۔ یقیناً محمد حسین آزاد کی نگاہ سے نکات الشعرا گزرا ہی نہ تھا ورنہ وہ میر کی شخصیت کے ساتھ ہرگز وہ زیادتی نہ کرتے جو "آب حیات" میں ان سے سرزد ہوئی۔

نکات الشعرا متنازعہ فیہ کتاب رہی ہے۔ میر نے اس میں دو ٹوک باتیں بھی کہی ہیں۔ اپنے زمانے کے شعرا کی تنقید بھی کی ہے، ان کے اشعار میں ترمیمیں اور اصلاحیں بھی کی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان تنقیدوں میں ذاتی عناصر بھی کار فرما ہوں گے جن کی نشاندہی تحقیق نگاروں نے کی ہے لیکن میر کے لکھے کو کوئی جھٹلا نہیں پایا ہے۔ انھوں نے جس شعر پر اصلاح کی ہے اس کو بہتر بنا دیا ہے بلکہ آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ محرک بھلے ہی ذاتی پرخاش ہو مگر ان کا فرمانا البتہ مستند ہوا ہے اور کسی نے بعد میں اس کو مسترد نہیں کیا ہے۔

نکات الشعرا کا فارسی متن مقدمہ کے ساتھ دو بار انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد دکن کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔ پہلی بار اس کو نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمن خاں شروانی کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۲۲ء میں شائع کیا گیا اور دوسری بار بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ اس کو ۱۹۳۵ء میں شائع کیا گیا۔ دونوں مقدمے اپنی جگہ محکم ہیں اور قابل مطالعہ ہیں۔ اس کو تیسری بار ڈاکٹر محمود الٰہی سابق صدر شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی کے طویل مقدمے کے ساتھ اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ نے جنوری ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر محمود الٰہی کے سامنے انجمن کے مطبوعہ نسخہ کے علاوہ پیرس کا مخطوطہ بھی تھا۔ انھوں نے دونوں نسخوں کو ملا کر اس کی تدوین کی اور حواشی لکھے ہیں ہم نے اکاڈمی کے نسخہ کو ہی اپنے ترجمے کی بنیاد بنایا ہے۔ اس کے بہت سے

حواشی جہاں ضروری سمجھے متن میں شامل کر دیئے ہیں اور بعض ویسے ہی رہنے دیئے ہیں البتہ ان کا ترجمہ اردو میں کر دیا ہے جب کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اختلاف متن فارسی میں ہی دیا تھا۔ بعض حواشی حذف کر دیئے ہیں کیونکہ ان سے متن میں علاوہ معمولی اختلاف ظاہر کرنے کے اور کوئی مطلب حل نہیں ہوتا تھا۔ اکا دکا حواشی راقمہ نے تشریح و خلاصہ معنی کے پیش نظر لکھ دیئے ہیں ڈاکٹر محمود الٰہی نے خود بھی قوسین لگا کر جہاں ضروری سمجھا تھا اختلاف متن کو متن میں داخل کر دیا تھا، ہم نے وہ قوسین ہٹا دیئے ہیں اس لیے اب اسی کو تحقیق شدہ متن شمار کرنا چاہیئے۔ راقمہ نے اپنی جانب سے بعض جگہ قوسین میں تشریحی فقرے لکھ دیئے ہیں تاکہ قاری کو کہیں الجھن نہ ہو۔

نکات الشعرا کا اردو ترجمہ ایک اطلاع کے مطابق جناب ایم۔ کے فاطمی کا کیا ہوا سن ۱۹۶۸ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا جو اب بازار میں دستیاب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ ترجمہ بہترین بھی نہیں تھا۔ ایسی اہم کتاب کے ترجمے میں جس احتیاط اور عرق ریزی کی ضرورت ہے راقمہ نے حتی الامکان اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔

نکات الشعرا کی اہمیت کئی طرح سے ہے۔ اول تو یہ اردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے اس لیے اس کی تاریخی اہمیت ہے، دوم یہ میر تقی میر نے لکھا ہے جو خود عظیم شاعر ہیں، سوم اس میں ڈھائی سو برس قبل کے اردو شعرا کے بڑے شگفتہ اور کامیاب خاکے ہیں، ان کے بہترین اشعار ہیں چہارم اس میں اردو شاعری کی تنقید کے اولین خدوخال ہیں۔ اس زمانے کے تنقیدی پیمانے ہیں جو اب گم ہو گئے ہیں۔ کلاسیکی شاعری کو کلاسیکی کسوٹیوں کے ساتھ اگر پڑھا جائے گا تو شاید سخن فہمی کا حق زیادہ ادا ہو گا اور کیا خبر ان پیمانوں کی آج بھی ضرورت ہو اس لیے ان کو سامنے آنا چاہیے۔ پنجم یہ کہ میر کے تنقیدی پیمانے جان کر ہم ان کی شاعری کا بہتر شعور کر سکتے ہیں۔

حمیدہ خاتون
(ایم۔اے فارسی)

ستمبر ۱۹۹۴ء، نئی دہلی

فہرست شعراء

آبرو، نجم الدین (عرف مبارک شاہ) ۲۰
آرزو، سراج الدین علی خاں ۱۵
آزاد ۸۵
احسن اللہ ۳۴
احمد گجراتی ۸۹
اشتیاق، شاہ ولی اللہ ۱۸
اشرف
امید، قزلباش خاں ۱۹
انسان، اسد یار خاں ۱۱۴
بسمل ۱۳۶
بہار، لالہ ٹیک چند ۱۲۰
بھید، میر میراں سید نوازش خاں
بیتاب، محمد اسمٰعیل ۷۱
بیچارہ ۹۴
بیدار، محمد علی (میر مہدی) ۱۱۶
بیدل، مرزا عبدالقادر ۱۴
بیرنگ، دلاور خاں ۱۳۸
بے نوا ۳۶
پاکباز، میاں صلاح الدین ۷۲
پیام، شرف الدین ۳۴
تاباں، میر عبدالحئی ۹۸
تجرد، میر عبداللہ ۹۵
تمکین، میاں صلاح الدین ۱۲۴
ثاقب، میاں شہاب الدین ۷۹
جعفر ۹۳
جعفر زٹلی ۳۰
جگن ۱۲۵
حاتم، شیخ محمد حاتم ۶۸
حزیں، میر محمد باقر ۹۶
حسن ۹۳

حسن، میر حسن ۱۲۳
حسیب ۹۴
حشمت، محمد علی ۹۷
حشمت، میر محتشم علی خاں ۶۵
خاکسار، محمد یار ۱۰۳
خسرو، امیر خسرو ۱۴
خوشنود ۹۲
دانا، فضل علی ۱۱۳
داؤد، مرزا داؤد ۹۵
درد، خواجہ میر ۵۰
درد، کرم اللہ ۶۶
دردمند، محمد فقیہہ ۱۰۴
راقم، بندرابن ۱۲۹
رسوا ۱۰۸
زکی، جعفر علی خاں ۱۲۳
سالک ۹۱
سجاد، میر سجاد ۵۷
سراج ۸۵
سعادت، سعادت علی ۳۵
سعدی ۹۴
سلام، نجم الدین ۱۲۰
سودا، مرزا محمد رفیع ۳۸
شاغل ۱۳۸
شعوری ۸۹
شوق، میاں حسن علی ۱۰۶
صبائی ۹۰
ضیا، میاں ضیاء الدین ۱۲۹
ضیا، مرزا عطا بیگ ۸۸
عاجز ۱۳۴
عاجز، عارف علی خاں ۸۷
عارف، محمد عارف ۱۱۵
عاصی، خواجہ برہان الدین ۱۰۵
عبدالبر ۹۳
عبدالرحیم ۹۳
عزلت، سید عبدالولی ۸۳
عزیز اللہ ۹۳
عشاق ۱۳۵
عطا ۳۷
غریب، محمد امان اللہ خاں (محمد زماں) ۱۲۵
غواصی ۹۲

فخری ۹۱
فضلی ۹۰
فغاں، اشرف علی خاں ۶۶
قاسم، مرزا ۸۹
قائم، محمد قائم ۱۰۹
قدر ۱۳۲
قدرت، قدرت اللہ ۱۳۹
کافر، میر علی نقی ۱۳۳
کلیم، محمد حسین ۴۶
کمترین ۱۳۴
گرامی، مرزا ۱۹
لطفی ۹۱
محسن، محمد محسن ۱۳۶
محمود ۹۰
مخلص، رائے آنند رام ۳۰
مضمون، شرف الدین ۲۴
مظہر، مرزا جان جاں ۱۶
معز، فطرت موسوی ۱۶
ملک ۹۱
موزوں، خواجم قلی خاں ۹۶
میر گھاسی ۱۳۴
میر میراں ۹۵
میر (میر سوز) ۱۴۵
میر، میر محمد تقی ۱۴۰
ناجی، محمد شاکر ۳۱
نثار، عبدالرسول ۱۳۲
ولی ۸۱
ہاتفی ۹۴
ہاشم ۹۲
ہدایت، ہدایت اللہ ۱۱۵
یکدل، میر عزت اللہ ۱۳۹
یکرنگ، مصطفیٰ خاں ۲۷
یکرو ۷۳
یقین، انعام اللہ خاں ۷۱
یونس، حکیم یونس ۹۶

مقدمہ مصنّف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سخن کو پیدا کرنے والے خدا کی حمد کے بعد جو لائقِ تحسین ہے، لامحدود درود اُس پر جو آسمان و زمین کی تخلیق کا مقصود اور گناہ گاروں کی شفاعت کرنے والا ہے اور اس کی تمام آل اولاد پر۔

پوشیدہ نہ رہے کہ فنِ ریختہ میں جو قلعۂ معلّٰی شاہ جہان آباد دہلی کی زبان میں فارسی شاعری کے طرز کی شاعری ہے آج تک ایسی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی جس سے اِس فن کے شاعروں کا حال صفحۂ روزگار پر (باقی) رہے۔ اسی لیے یہ تذکرہ جس کا نام "نکات الشعرا" ہے لکھا جارہا ہے۔

حالانکہ ریختہ دکن سے[1] (تعلق رکھتی) ہے مگر چونکہ اِس مقام سے ایک بھی مربوط شاعر نہیں اٹھا اس لیے اُن کے ناموں سے شروع نہیں کیا گیا اور اِس ناقص (یعنی مصنف) کی طبیعت اِس طرف یوں بھی مصروف نہیں ہے کہ اُن میں سے اکثر کا احوال ملول کرتا پھر بھی اُن میں سے بعض کا احوال لکھا جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

امید ہے کہ جس صاحبِ سخن کے ہاتھوں میں یہ کتاب پہنچے گی وہ اسے شفقت کی نگاہ سے دیکھے گا۔

(میر تقی میرؔ)

۱ انجمن: در بعضی میں

امیر خسرو

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ[1] (کی ذات گرامی) مجموعۂ کمالات (تھی) اور اُن کی زندگی) گوناگوں واقعات سے پُر ہے۔ اُن کے فضائل سورج کی طرح روشن ہیں[2]۔ امیر مذکور (کی زندگی) کے حالات (جا بجا) تذکروں میں لکھے ہوئے ہیں (اس لیے) اِس احقر العباد کا لکھنا فضول ہے۔

اِس بزرگ کے ریختہ اشعار بہت سے ہیں۔ ان کو اِس امر میں کوئی تردد (یا تامل) نہیں تھا۔ اِس تمام سے ایک قطعہ بطورِ تبرک لکھا جارہا ہے:

زرگر پسرے چو ماہ پارا — کچھ گھڑیے سنوارے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست — پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

بیدل

مرزا عبدالقادر بیدلؔ، فارسی کا پُرزور شاعر، پچاس ہزار اشعار و مثنویات (پر مبنی) دیوان کا مالک تھا۔ آغازِ جوانی میں شاہزادہ محمد اعظم شاہ کا نوکر ہوا۔ کچھ مدت کے بعد معاش (کا سلسلہ) ترک کر کے خانہ نشین ہوا۔ اِس کے مذاقِ شعری سے پتہ چلتا ہے کہ اِس کو عرفان سے پورا حصہ ملا تھا۔ اِس کے حالات (زندگی) تفصیل کے ساتھ تذکروں میں لکھے ہوئے ہیں۔ اِس کے

۱ پیرس: قدس سرہ
۲ اِس فقرے پر نسخۂ پیرس کا صفحہ ۲ ختم ہوتا ہے، اس کے بعد کی عبارت نہیں ملتی کیونکہ اِس نسخے سے ورق ۳ غائب ہے۔
۳ شورش: در اوائل (یعنی آغاز میں)

نام سے ریختہ کے دو اشعار سنائے جاتے ہیں شاید کسی تقریب کے موقع پر کہے ہوں گے:

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

آرزو

سراج الدین علی خاں آرزو، آب و رنگِ باغ نکتہ دانی، چمن آرائے گلزار معانی، بلاغت، کہ جس کے لیے (بڑی) قوت درکار ہے، کے ملک کا فرمانروا فصاحت کے میدان کا شہ زور شاعر، صفائے گفتگو سے (دل کو) باغ باغ کر دینے والوں (کے سلسلہ) کا چراغ۔ اس کا چراغ (یوں ہی) روشن رہے۔ خدا تعالیٰ سراج الدین علی خاں آرزو کو ابد تک (زندہ و) سلامت رکھے۔ ہندستان جنت نشاں میں اِن جیسا زبردست، قادر الکلام شاعر، عالم و فاضل آج تک پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ (یہ) بحث ایران تک چلی جاتی ہے۔ یہ شہرۂ آفاق، سخن فہمی میں طاق، دس پندرہ کتابوں، رسالوں دیوان اور مثنویات کا مصنف۔ ان کے کمالات کے نتائج بیان کے دائرے سے باہر ہیں۔ ریختہ (گوئی) کے فن کے تمام مضبوط اساتذہ اس بزرگوار کے شاگرد ہیں۔ کبھی کبھار تفنن طبع کے لیے دو تین اشعار ریختہ کے (ارشاد) فرما دیتے ہیں۔ اس بے اعتبار فن کو جس کو ہم نے اختیار کیا انھوں نے ہی اعتبار بخشا ہے تبرک کے طور پر لکھا جا رہا ہے۔

جان تجھ پر کچھ اعتماد نہیں
زندگانی کا کیا بھروسہ ہے
مے خانہ بیچ جا کر شیشے تمام توڑے
زاہد نیں آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

رکھے سیپارۂ گل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

وعدے تھے سب خلاف جو تجھ لب سے ہم سُنے
یہ لعل قیمتی دیکھو، جھوٹا نکل گیا

ہر صبح آوتا ہے تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

معز فطرت موسوی

مرزا معز فطرت موسوی خاں، جن کا خطاب موسوی خاں ہے۔ معز، فطرت اور موسوی تینوں تخلص (استعمال) کرتے ہیں۔ ان کے حالات سراج الدین علی خاں آرزو کے تذکرے میں ہو بہو درج ہیں جو بندے کے استاد و پیر و مرشد ہیں، جیسا کہ سنا ویسا ہی لکھا ہے کہ ریختہ کا یہ شعر اسی شاعر کا کہا ہوا ہے، خدا بہتر جانے:

از زلف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

مظہر جانجاں

مرزا جانِ جاں مظہر تخلص، مقدس، پاک، درویش، عالم (و فاضل) صاحبِ کمال، عالم میں مشہور، بے مثال، معزز و مکرم انسان ہے، اکبر آباد (آگرے) کا رہنے والا ہے۔ اِس کے والد کا نام مرزا جان تھا۔ شفقت پدری

زیادہ ہونے کے سبب وہ (ان کو) مرزا جان جاں کہا کرتے تھے، اسی وجہ سے یہ نام مشہور ہوا ہے۔ بندہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سعادت حاصل کر چکا ہے۔ زیادہ وقت یادِ الٰہی میں گزارتے ہیں اور اس درجہ اچھی باتیں کرتے ہیں جن کا تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔ ان کی فارسی شاعری کا مختصر دیوان فقیر کی نگاہ سے گزرا ہے۔ اس کا مرتبہ سلیم اور کلیم کے کلام سے ہرگز کم نہیں ہے اگرچہ ہندی میں شعر کہنا ان کے مرتبے سے پست ہے لیکن کبھی کبھار اس بے اعتبار فن (کی جانب) بھی متوجہ ہوتے ہیں۔ انعام اللہ یقین اور حزیں جو ریختہ کے شعرا ہیں انھیں کے شاگرد ہیں۔ الغرض مرزا جان جاں مظہر عجیب و غریب شخص ہیں۔ (نمونۂ کلام):

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

جواں مارا گیا خوبوں کے اوپر میرزا مظہر
بھلا تھا یا برا تھا، زور کچھ تھا، خوب کام آیا

غزل

اوس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہات
اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ہات
کب چھوٹتا ہے، پھر کے جو مفلس گرو کیے
اب تو پھنسا ہے آن دل اس بیوفا کے ہات
مرتا ہوں میرزائی گل دیکھ ہر سحر
سورج کے ہات چوسری دیکھا صبا کے ہات
آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے
مینا لگا ہے جب ستیں مجھ بے نوا کے ہات
مظہر چھپا کے رکھ دل نازک کتیں ترے
یو شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہات

کسی کے خون کا پیاسا کسی کی جان کا دشمن
نہایت منہ لگایا ہے سجن نے بیڑۂ پاں کو

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے کچھ چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

آتش کہو، شرارہ کہو، کوئلا کہو
مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

گر گل کو گل کہوں تو ترے روکوں کیا کہوں
بونوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

اشتیاق

شاہ ولی اللہ اشتیاق۔ ایک ذی علم شخص ہے۔ شیخ مجدد الف ثانی کی اولاد سے ہے، شاہ محمد گل کا نواسہ ہے۔ اس کی جائے ولادت سرہند ہے۔ کوٹلہ فیروز شاہ (دہلی) میں رہتا ہے۔ توکل (قناعت کرنے والا درویش ہے۔ کبھی کبھار ریختہ میں شعر گوئی کرتا ہے اور یہ اشعار اس کے کلام سے ہیں؛

لڑکوں کے پتھروں کی لگے کیونکے اس کو چوٹ
ہر ایک گرد باد ہے مجنوں کو ڈھول کوٹ

چھوڑ کر تجکو ہمیں اور سے جو لاگ لگی
نہیں مہندی یہ ترے تلووں سیتی آگ لگی

زیادہ ہونے کے سبب وہ (ان کو) مرزا جان جاں کہا کرتے تھے، اسی وجہ
سے یہ نام مشہور ہوا ہے۔ بندہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سعادت حاصل
کر چکا ہے۔ زیادہ وقت یادِ الٰہی میں گزارتے ہیں اور اس درجہ اچھی باتیں
کرتے ہیں جن کا تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔ ان کی فارسی شاعری کا مختصر دیوان
فقیر کی نگاہ سے گزرا ہے۔ اس کا مرتبہ سلیم اور کلیم کے کلام سے ہرگز کم نہیں ہے
اگرچہ ہندی میں شعر کہنا ان کے مرتبے سے پست ہے لیکن کبھی کبھار اس
بے اعتبار فن (کی جانب) بھی متوجہ ہوتے ہیں۔ انعام اللہ یقین اور حزیں جو
ریختہ کے شعرا ہیں انھیں کے شاگرد ہیں۔ الغرض مرزا جان جاں مظہر عجیب و
غریب شخص ہیں۔ (نمونۂ کلام):

خدا کے واسطے اس کوں نہ ٹوکو   یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

جواں مارا گیا خوبوں کے اوپر میرزا مظہر
بھلا تھا یا بُرا تھا، زور کچھ تھا، خوب کام آیا

غزل

اوس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہات
اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ہات

کب چھوٹتا ہے، پھر کے جو مفلس گرو رکھے
اب تو پھنسا ہے آن دل اس بیوفا کے ہات

مرتا ہوں میرزائی گل دیکھ ہر سحر
سورج کے ہات چوری ویکھا صبا کے ہات

آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے
مینا لگا ہے جب ستیں مجھ بے نوا کے ہات

مظہر چھپا کے رکھ دل نازک کتیں ترے
یو شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہات

کسی کے خون کا پیاسا، کسی کی جان کا دشمن
نہایت منہ لگایا ہے سجن نے بیڑۂ پان کو

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے کچھ چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

آتش کہو، شرارہ کہو، کوئلا کہو
مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

گر گل کو گل کہوں تو ترے روکوں کیا کہوں
بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

اشتیاق

شاہ ولی اللہ اشتیاق۔ ایک ذی علم شخص ہے۔ شیخ مجدد الف ثانی
کی اولاد سے ہے، شاہ محمد گل کا نواسہ ہے۔ اس کی جائے ولادت سرہند
ہے۔ کوٹلہ فیروز شاہ (دہلی) میں رہتا ہے۔ توکل و قناعت کرنے والا
درویش ہے۔ کبھی کبھار ریختہ میں شعر گوئی کرتا ہے اور یہ اشعار اس
کے کلام سے ہیں:

لڑکوں کے پتھروں کی لگے کیونکے اس کو چوٹ
ہر ایک گرد باد ہے مجنوں کو ڈھول کوٹ

چھوڑ کر تجکو ہمیں اور سے جو لاگ لگی
نہیں مہندی یہ ترے تلووں سیتی آگ لگی

زیادہ ہونے کے سبب وہ (ان کو) مرزا جان جاں کہا کرتے تھے، اسی وجہ
سے یہ نام مشہور ہوا ہے۔ بندہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سعادت حاصل
کر چکا ہے۔ زیادہ وقت یادِ الٰہی میں گزارتے ہیں اور اس درجہ اچھی باتیں
کرتے ہیں جن کا تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔ ان کی فارسی شاعری کا مختصر دیوان
فقیر کی نگاہ سے گزرا ہے۔ اس کا مرتبہ سلیم اور کلیم کے کلام سے ہرگز کم نہیں ہے
اگرچہ ہندی میں شعر کہنا ان کے مرتبے سے پست ہے لیکن کبھی کبھار اس
بے اعتبار فن (کی جانب) بھی متوجہ ہوتے ہیں۔ انعام اللہ یقین اور حزیں جو
ریختہ کے شعرا میں انھیں کے شاگرد ہیں۔ الغرض مرزا جان جاں مظہر عجیب و
غریب شخص ہیں۔ (نمونۂ کلام):

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو — یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

جواں مارا گیا خوبوں کے اوپر میرزا مظہر
بھلا تھا یا بُرا تھا، زور کچھ تھا، خوب کام آیا

غزل

اوس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہات
اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ہات

کب چھوٹتا ہے، پھر کے جو مفلس گرو کیے
اب تو پھنسا ہے آن دل اس بیوفا کے ہات

مرتا ہوں میرزائی گل دیکھ ہر سحر
سورج کے ہات چوری و پنکھا صبا کے ہات

آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے
مینا لگا ہے جب ستیں مجھ بے نوا کے ہات

مظہر چھپا کے رکھ دل نازک کتیں ترے
یو شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہات

کسی کے خون کا پیاسا کسی کی جان کا دشمن
نہایت منہ لگایا ہے سجن نے بیڑۂ پان کو

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے کچھ چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

آتش کہو، شرارہ کہو، کوئلا کہو
مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

گر گل کو گل کہوں تو ترے روکوں کیا کہوں
بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

اشتیاق

شاہ ولی اللہ اشتیاق۔ ایک ذی علم شخص ہے۔ شیخ مجدد الف ثانی
کی اولاد سے ہے، شاہ محمد گل کا نواسہ ہے۔ اس کی جائے ولادت سرہند
ہے۔ کوٹلہ فیروز شاہ (دہلی) میں رہتا ہے۔ توکل و قناعت کرنے والا
درویش ہے۔ کبھی کبھار ریختہ میں شعر گوئی کرتا ہے اور یہ اشعار اس
کے کلام سے ہیں:

لڑکوں کے پتھروں کی لگے کیونکے اس کو چوٹ
ہر ایک گرد باد ہے مجنوں کو ڈھول کوٹ

چھوڑ کر تجکو ہمیں اور سے جو لاگ لگی
نہیں مہندی یہ ترے تلووں سیتی آگ لگی

بتاں جو ہجر کی باتیں ہمیں سناتے ہیں
کچھ ان کا دوس نہیں یہ خدا کی باتیں ہیں

امید

قزلباش خاں امید، ایک مغل شخص تھا۔ فارسی کا عمدہ شاعر، نکتہ پرداز، بذلہ سنج، جواں دل، دلوں کا پیارا، یار باش، ملنسار، ہمیشہ مسکراتا اور (پھولوں کی طرح) شگفتہ چہرہ، اپنے قیمتی اوقات کو خوشی اور انبساط کے ساتھ بسر کرتا تھا۔ امرا اور خوانین کے ساتھ منسلک (رہتا) تھا۔ ہر ایک سیر اور تماشے میں جایا کرتا تھا اور یک دل، صاحبِ طبع دوستوں کے ساتھ، خوب ملنا جلنا رکھتا تھا۔ چنانچہ ایک دن سید حسن رسول نما صاحب قدس سرہ العزیز کے عرس کے موقع پر بندہ بھی اپنے دوستوں کے کہنے پر وہاں پہنچا ہوا تھا اور وہ بھی (وہاں) تشریف رکھتا تھا۔ مجھ کو دور سے (ہی) دیکھ کر بولا کہ خوش ہو جائیے میں نے بھی ان دنوں ریختہ کے دو شعر موزوں کیے ہیں۔ سنیے، یہ (اشعار) اس کے ہیں:

عجب در و دیوار سے اب صحبت ہے — یار بن گھر میں عجب صحبت ہے

تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں — الحفیظ، الحفیظ کرتا ہوں

مرزا گرامی

مرزا گرامی، غنی بیگ کشمیری کا بیٹا ہے جو کہ قبول تخلص کرتا تھا۔ اس کے احوال (زندگی) خاں صاحب کے تذکرے میں منقول ہیں۔ جب اس نے

دیکھا کہ ریختہ کا بازار گرم ہے تو اس نے بھی ریختہ کے شعر کہے۔ شعر نمونے کے طور پر جو تھا وہ اس طرح ہے:

حاضری بن محل نہیں کھاتا — بیگمی ہے پنیر منعم کا

مخلص

رائے آنند رام نام اور مخلص تخلص مشہور ہے۔ شاہجہاں آباد سے ہے۔ نواب وزیر اعتماد الدولہ مغفور و مرحوم کا وکیل تھا۔ فارسی کا خاصا اچھا شاعر۔ آغاز جوانی میں مرزا بیدل کے خدمت میں مشق سخن کیا کرتا تھا۔ اُن دنوں اپنے اشعار خاں صاحب سراج الدین علی خاں کو دکھاتا تھا۔ ایک مدت سے مرض سل میں مبتلا تھا۔ قریب ایک سال ہوا کہ انتقال کر گیا ہے۔ اس کا احوال خاں صاحب کے تذکرے میں مذکور ہے:

دھوم آونے کی کس کے گلزار میں پڑی ہے
ہاتھ ارگجے کا پیالہ نرگس لیے کھڑی ہے

آبرو

میاں نجم الدین عرف شاہ مبارک، آبرو تخلص۔ وطن گوالیار ہے، حضرت محمد غوث گوالیاری، خدا اس کے مرقد[1] کو نور سے بھر دے، کا نواسہ ہے۔ ابتدائے جوانی میں شاہجہاں آباد آ گیا تھا، چنانچہ مشق سخن بھی اسی مقام پر کی۔ خاں صاحب سراج الدین علی خاں کا شاگرد ہے۔ رجال زمانہ کی چشم پوشی سے اس کی ایک آنکھ بیکار ہو گئی۔ ریختہ کا بے مثال شاعر ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا مزاج شوخ تھا۔ الغرض اپنے زمانہ سے بے نیاز[2] تھا کیونکہ محمد شاہ[3] بادشاہ

---

۱ پیرس: قبرہ (بمعنی قبر) ۲ پیرس: مستغنی ۳ پیرس: در عہد محمد شاہ بادشاہ بود (بمعنی محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں تھا)

کا عہد تھا۔ خدا اس کی مغفرت فرمائے۔ اس کے کچھ متفرق اشعار اس طرح ہیں:

آیا ہے صبح نیند سے اٹھ رسمسا ہوا
جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا

جوانی کے زمانہ کی میاں کیا زیادتی کہیے
کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گزری سو جگ بیتا

بوسہ لبوں کا دینے کہا کہہ کے پھر گیا
پیالہ بھرا شراب کا افسوس گر گیا

قول آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اس گلی
ہو کر کے بے قرار دیکھو آج پھر گیا

مشتاقِ عذر خواہی نہیں آبرو تو کیا ہے
یہ روٹھ روٹھ چلنا، چل چل کے پھر ٹھٹھکنا

فرہاد کا دل کوہ کوے کا بھرا پیالہ ہوا
مستی سے جس کے شوق کی ہر سنگ متوالا ہوا

دل کے آبر بہار میں احوال سخت دیکھ
دے مارتی ہے باغ میں سر کو کلی اٹھا

یہ سبزہ اور یہ آبِ رواں ابر یہ گھرا
دِوانا ہیں کہ گھر میں رہوں چھوڑ کے صحرا

گریہ ہے مسکرانا تو کس طرح جئیں گے
تم کو تو یہ ہنسی ہے پر ہے مرن ہمارا

یارو ڈرو کمر سے مڑوڑو نہ بھر کے انگ
آجا کہیں لچک تو ابھی لاگ جائے لنگ

دور خاموش بیٹھ رہتا ہوں   اس طرح حال دل کا کہتا ہوں

سر سے لگا کے پاؤں تلک دل ہوا ہوں میں
یہاں لگ ہنر میں عشق کے کامل ہوا ہوں میں

دل کب آوارگی کو بھولا ہے   خاک اگر ہو گئی بگولا ہے

آغوش میں بھواں کی کرتی ہیں قتل آنکھیں
کوئی پوچھتا نہیں ہے مسجد میں خون ہوا ہے

کرتے تو ہو تغافل پر حال آبرو کا   دیکھو تو تم بھی پیارے بے اختیار رودو

نہیں تارے بھرے ہیں شک کے نقط
اس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

اگر "اس قدر" کے بجائے "کس قدر" کہا ہوتا تو شعر آسمان کو پہنچ جاتا۔

مجھ ناتواں کی حالت وہاں جا کہے ہے اُڑ کر
میرا یہ رنگِ رو ہے گویا کبھی کبوتر

عالم آب سیں آساں نہیں اے شیخ گزر
خوف سے غرق کے یہاں بحر ہے کشتی میں سوار

خوب تیری شکل آ نہیں سکتی تصویر میں
مدتیں گزریں مصور کھینچتا ہے انتظار

کریں جو بندگی ہو ویں گنہ گار   بتوں کی کچھ نرالی ہے خدائی

آبرو کے قتل پر حاضر ہوا کس کر کر
خون کرنے کوں چلے عاشق پہ تہمت باندھ کر

زندگی ہے سراب کی سی طرح   باؤ بندی حباب کی سی طرح
تجھ اوپر خون بے گناہوں کا   چڑھ رہا ہے شراب کی سی طرح
کون چاہے گا گھر بسے تجھکو   مجھ سے خانہ خراب کی سی طرح

کیوں چھپا ظلمت میں گر تجھ لب سے شرمندہ نہ تھا
جان کچھ پانی مرے ہے چشمۂ حیواں کے بیچ

مجلس رنداں میں مت لے جا دلِ بے شوق کو
شیشۂ خالی کو کیا عزت ہے مے خواروں کے بیچ

کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہو گی   اس دل بے قرار کی صورت

نہ تھا کچھ اور میرے شوق کا حسن وصفا باعث
یہی پیاری طرح موجب یہی کا فرادا باعث

تم اور گل رخاں سے اب آنکھ جو لگائے
بادام کو پیارے پھولوں کے بیچ باسا

دل تو دیکھو آدمِ بے باک کا   عشق سے پتلا بھرا ہے خاک کا

سجن اوروں کا تشنہ ہو کے سنتا اور سب کہتا
مگر ایک آبرو کی بات جب کہتے تو پی جاتا

انسان ہے تو کبر سے کہتا ہے کیوں اَنا
آدم کو تو سُنا ہے کہ ہے خاک سے بنا

رہتے ہیں جیو میں مصرع دل چسپ کی طرح
گھر بار ہو رہے سرو قدوں کا برائے بیت
کیوں ملامت اس قدر کرتے ہو بے حاصل ہے یہ
لگ چکا اب چھوٹنا مشکل ہے اس کا دل ہے یہ

قطعہ

زلف کی شان مکھ او پر دیکھو   کہ گویا عرش میں لٹکتی ہے
کیا ہوا مر گیا اگر فرہاد   روح پتھر سے سر پٹکتی ہے
تمہاری لوگ کہتے ہیں کمر ہے   کہاں ہے، کس طرح کی ہے، کدھر ہے
یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتیں
جب رو برو ہو تیرے گفتار بھول جاوے

اب دین ہوا زمانہ سازی   آفاق تمام دہریا ہے
جیونا مثلِ حباب اس جگ میں دم کا پیچ ہے
یہ گرہ کھل جا تو دیکھو زندگانی ہیچ ہے
زندگانی تو ہر طرح کاٹی   مر کے پھر جیونا قیامت ہے
اٹھ چیت کیوں جنوں ستی خاطر نچنت کی
آئی بہار تجکو خبر ہے بسنت کی

جہاں تجھ خو کی گرمی تھی نہ تھی کچھ آگ کو عزت
مقابل اس کے ہو جاتی تو آتش لکڑیاں کھاتی
ٹک چلنا سجن کا بھولتا نہیں اب تلک مجکو
طرح وہ پاؤں رکھنے کی میری آنکھوں میں پھرتی ہے
اس کی کنجی زبانِ شیریں ہے   دل مرا قفل ہے بتاشے کا
حسن ہے پر خوبرویاں میں وفا کی خو نہیں
پھول ہیں یہ سب پر ان پھولوں میں ہرگز بو نہیں
قیامت کیا تم ٹک ایک ہنس کے بولے   مجھے بات کی بات میں مار ڈالا

مضموؔن

میاں شرف الدین، مضموؔن تخلص۔ ایک نوکر پیشہ آدمی تھا، جاجمؤ کا رہنے والا کہ جو ایک قصبہ ہے اکبر آباد کے قریب۔ حریف و ظریف، ہشاش و بشاش، مجلسوں میں ہنگامے گرم کرنے والا۔ اگرچہ کم گو تھا لیکن بہت خوش فکر اور لفظِ تازہ کی تلاش زیادہ سے زیادہ کرنے والا تھا۔ اس کا دیوان (دگو کہ) ہر جہت یا طرز کا عامل ہے مگر دو سو اشعار کا ہوگا۔

جوانی کے شروع میں وہ ہی شاہ جہاں آباد آگیا تھا اور زینت المساجد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آخر کار اسی جگہ وفات پائی۔ حضرت شیخ فرید شکر گنج

ایہام

ناحق ستم کسی پر وہ شوخ کد کرے ہے
دیتا ہے ٹانگ اس کو جو فعل بد کرے ہے

ایہام

چھوٹے سینوں سے یوں ہوا معلوم — تیری آنکھوں کے (رنگ) دو پکے ہیں
میرا پیغام وصل اے قاصد — کہیو سب سے اسے جدا کرکر

اتفاق سے (جب) میں اس کے اشعار منتخب کر رہا تھا تو میاں محمد حسین کلیم بھی اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ان (کلیم) کا احوال بھی آئے گا۔ میں نے ان کے سامنے یہ شعر پڑھا اور شعر اس طرح اس کے دیوان میں لکھا ہوا تھا:

میرے پیغام کو تو اے قاصد — کہیو سب سے اسے جدا کرکر

انھوں نے کہا کہ اگر "پیغام کو" کے بجائے "پیغام وصل" کہتے تو یہ نچلے درجے سے اعلیٰ درجہ کا ہو جاتا۔ چونکہ یہ بات شعرا کے سلیقہ کے مطابق تھی اس لیے اس کو اس طریقہ پر لکھ دیا گیا ہے۔

کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج — ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں
ایک تو گل بے وفا اور تس پہ جور باغباں

اگر پاؤں تو مضموں کو رکھوں باندھ — کروں کیا جو نہیں لگتا میرے ہاتھ

مرد نے بوجھ پکڑا مشکل ہوا ہے جینا
یارو خدا کرے خیر بھاری ہے یہ مہینا

خط آگیا ہے اس کے مری ہوئی سفید ریش
کرتا ہے اب تلک بھی وہ ملنے میں شام وصبح

کی اولاد میں سے تھا۔ خدا اس کی قبر کو نور سے بھر دے۔ چنانچہ خود کہتا ہے:

کریں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید
کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید

خاں صاحب سراج الدین علی خاں کا شاگرد ہے۔ چونکہ نزلہ کی وجہ سے اس کے تمام دانت گر گئے تھے۔ خاں صاحب مرقوم اس کو شاعر بیدانہ کہا کرتے تھے۔ فقیر نے اس کو اس کے آخری ایام میں دیکھا تھا۔ بڑی گرم جوشی سے ملنے والا (شخص) تھا حالانکہ (اس وقت تک) بڑھاپے کی ٹھنڈک غلبہ پا چکی تھی۔ یقیناً خدا نے اس کا انجام بخیر کیا ہوگا۔

اس دوران اس کے دیوان سے انتخاب کیا ہوا (کلام) دکھائی دیا (وہی) لکھا جا رہا ہے۔ اس (کے کلام) سے ہے:

جو دو پیالہ سحر کو بھر کے اور دو شام کو لے گا
وہ تخت اپنے میں جوں خورشید چاروں دھام کو لے گا

ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا
صبر ایوبؑ کیا، گریہ یعقوبؑ کیا

ایہام

ایک تو تھا ہی وہ مہرو خود پسند
ہوگیا دیکھ آرسی کے تئیں دوچند

ہنسی تیری پیارے پھلجھڑی ہے
یہی غنچہ کے دل میں گل چھڑی ہے

ایہام

میکدے میں گر سراسر فعل نامعقول ہے
مدرسہ دیکھا تو وہاں بھی فاعل ومفعول ہے

چلا کشتی میں آئے سے جو وہ محبوب جاتا ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے
میرا یہ اشک قاصد کی طرح یکدم نہیں تھمتا
کسی بے تاب کا گویا یہ مکتوب جاتا ہے

مضموں تو شکر کر کہ ترا اسم سن رقیب
غصے سے بھوت ہو گیا لیکن جلا تو ہے

شاعرِ مسطور نے 'اسم' کے بجائے نام موزوں کیا تھا۔ 'اسم' خاں صاحب کی اصلاح ہے اور اصلاح کی وجہ یہ ہے کہ افسوں پڑھنے والے 'اسم' کہتے ہیں نام نہیں۔ بس سمجھ لو!

یکرنگ

نام مصطفیٰ خاں، یکرنگ تخلص۔ ریختہ کا شاعر، میاں آبرو کا معاصر (کہتے ہیں دونوں میں) بہت زیادہ ملنا جلنا تھا اور اچھے دوست تھے۔ مجھ کو اس کا احوال اچھی طرح معلوم نہیں۔ اس کے کلام سے:

قطعہ

لب شیریں سے بے زبانوں کو — بولنا تلخ کام ہے تیرا
ہاتھ اٹھا جور اور جفا سے تو — یہی گویا سلام ہے تیرا
ترک عاشق نیں ننگ و نام کیا — کام اپنا جو تھا تمام کیا
اس قدر کیا ہے حمایت غیر کی — ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا

جب سیتی گل رخوں سے یار ہوا — خلق کی بیں نظر میں خوار ہوا
خلق یکرنگ کی ہوئی دشمن — جب سے تیرا وہ دوستدار ہوا

امام حسین صلوٰۃ اللہ علیہ کے مرثیہ میں بھی کہا ہے:

مرثیہ

زخمی برنگ گل ہیں شہیدانِ کربلا — گلزار کے نمط ہے بیابانِ کربلا
کھانے چلا ہے زخمِ ستم ظالموں کے ہاتھ — دھو ہاتھ زندگی ستی مہمانِ کربلا
اندھیرے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ — ہے سر بریدہ شمع شبستانِ کربلا

ریختہ

سنتا نہیں ہے بات کسی کی تو اے سجن
تجکو ترا غرور نجانوں کرے گا کیا

خون دل کا مجھے شراب ہوا — جگر سوختہ کباب ہوا

اِتا ہے مست اپنے حسن کی مے سے سجن میرا
کہ کھاتا ہے بیاں کرنے سیتی لغزش سخن میرا

نہ کر گوہر سیتی ہرگز برابر — اگر معلوم ہے رتبہ سخن کا
مجھے مت بوجھ پیارے اپنا دشمن — کوئی دشمن بھی ہو ہے اپنی جاں کا

اگر آوے مرے گھر وہ پیارا — کروں اس ماہ کو پتلی کا تارا
مرا دشمن ہوا یکرنگ وہ شوخ — کیا کیوں عشق میں نیں آشکارا

کم نہیں کچھ بوئے گل سیتی فغانِ عندلیب
برگ گل سے ہے گی نازک تر زبانِ عندلیب

زبان شکوہ ہے مہندی کا ہر پات — کہ خوبوں نیں لگائے ہیں مجھے ہات

مسخر حسن کے شاہ و گدا ہیں — رکھے ہیں خوبرو ظاہر کرامات
خیال چشم و ابرو کرے تیرا — کوئی مسجد گیا کوئی خرابات
یاد آتی ہے تازگی بہار — دیکھ ہر خشک خار کی صورت

سچ کہے جو کوئی سو مارا جائے راستی ہیگی دار کی صورت

فقیر کی رائے میں لفظ "سچ" کے بجائے "حرف حق" اولیٰ ہے، مناسبات کی رعایت سے یہی درست ہوگا۔

پھر گیا ہائے ہم سے وہ مہرو سرد مہری ستی ہوا کی طرح

ہوا نہ راحت جاں مہرباں حیف مری محنت گئی سب رائیگاں حیف

بنا بر مصلحت ہے یہ جو تم سے رہا ہے روٹھ دن دو چار یکرنگ

محبت کا عجب یکرنگ ہے رنگ
کبھی عاشق کبھی معشوق ہیں ہم

برنگ شمع دائم تجھ لگن میں سجن روتے پھرے ہم انجمن میں

تا گلے تیرے لگوں اے یار میں روٹھتا ہوں اس سبب ہر بار میں

کیوں کھینچتے ہو تیغ سجن ہم میں دم نہیں
پنہاں نگہ تمہاری یہ گپتی سے کم نہیں
کہتے ہیں ہم پکار سنو کان دھر سجن
گو غیر سے ملو گے تو دیکھو گے ہم نہیں

تجھ زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال
یکرنگ کے سخن میں خلاف ایک مو نہیں

دل مرا اس کے جو دُبدھا میں پڑے ہو اس بھانت
کیا سجن اس کا کوئی جگ میں خریدار نہیں

پارسائی اور جوانی کیونکے ہو ایک جاگہ آگ پانی کیونکے ہو

(فرد، ایہام)

اس پری پیکر کو مت انسان بوجھ
شک میں کیوں پڑتا ہے اے دل جان بوجھ

ایہام

برگ حنا اوپر لکھو احوال دل میرا
شاید کبھی تو جا لگے اس دلربا کے ہاتھ

جو کوئی توڑتا ہے غنچۂ گل دل کو میرے شکستہ کرتا ہے

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے میرا صبر و قرار جاتا ہے

گر خبر لینی ہے تو لے صیاد ہاتھ سے پھر شکار جاتا ہے

لگے ہے جا کے کانوں میں بتوں کے سخن یکرنگ کا کوئی گہر ہے

کیا جانئے وصال تیرا ہو کسے نصیب
ہم تو ترے فراق میں اے یار مر گئے

نہ تو ملنے کے قابل اب رہا ہے نہ مجھ کو وہ دماغ اور دل رہا ہے

اب تو تمہیں بنائے ہی ہم سے سجن پڑے
ہم سب طرف سے ہار تمہارے گلے پڑے

یکرنگ پاس کیا ہے سجن اور کچھ بساط رکھتا ہے دو نین جو کہو تو نظر کرے

جس کے درد دل میں کچھ تاثیر ہے
گر جواں بھی ہو تو میرا پیر ہے

چشم پیارے کی دیکھ مژگاں میں گویا سبزے کے بیچ آہو ہے

اس کو مت بوجھو سجن اوروں کی طرح
مصطفیٰ خاں آشنا یکرنگ ہے

اگر (یہ) میرا شعر ہوتا تو پہلا مصرع میں نے اس طرح موزوں کیا ہوتا:

مت تلوّن اِس میں سمجھے آپ سا

اُلفت نے سانوری کی رسوا کیا ہے ہم کو
جامے کو اپنے ہم نے گویا اگر میں باسا

اہل دل کے تیں ضرر ہے خرمی سیں دیکھ لے
کھلکھلا کر جو ہنسا غنچہ پریشاں ہو گیا

مداح خوش قدوں کا یکرنگ ہے عزیزاں
اس سیں ہوا ہے اوس کا ہر جائے بول بالا

میرے دل سے اٹھیں کیوں نہ بھبوکے خیال از بسکہ ہیں اوس شعلہ خو کے
رقیب اس طور جلتے ہیں مجھے دیکھ گویا رشتے میں ہیں اس شمع رو کے

جن صاحبوں کو کام نہ تھا عشق سے کبھی
یکرنگ اس جہاں میں وہ آرام کر گئے

نہ ہو سرکش جو مقصد پر نظر ہے صنوبر سرکشی میں بے ثمر ہے
رکھے ہے ....[1] سنو یارو گرہ میں جس کے زر ہے
جدائی میں تیری اے صندلی رنگ ....[2]... میں زندگانی دردِ سر ہے

ناجی

محمد شاکر، ناجی تخلص۔ ایک جوان تھا، چیچک رو، سپاہی پیشہ۔ اس کا مزاج زیادہ تر ہزل کے مسائل پر راغب تھا۔ میاں آبرو کا ہم عصر تھا۔ اُس کے ساتھ بندہ کی ایک ملاقات ہوئی۔ اپنی ہزل کے اشعار خود پڑھتا تھا۔ (اُن پر) لوگوں کو خوب ہنسی آتی تھی اور وہ خود نہیں ہنستا تھا مگر کبھی کبھار تبسم کرتا تھا۔ اس کا وطن شاہ جہاں آباد تھا، اِس جہاں سے جوانی میں ہی چلا گیا۔ خدا اُس پر رحمت کرے، اُس کے اشعار کا جستہ جستہ انتخاب کیا ہے وہ لکھے جا رہے ہیں۔ اس کے کلام سے نمونہ پیش ہے:

روا کب ہے مجھ او پر تیغ کو ہر دم علم کرنا
میری تقصیر بھی کچھ کی ہے ثابت یا ستم کرنا

[1،2] اصل نسخے میں الفاظ واضح نہیں ہیں۔

بلند آواز سے گھڑیال کہتا ہے کہ اے غافل
کٹی یہ بھی گھڑی تجھ عمر سے اور تو نہیں چیتا

نمکیں حسن دیکھ کے پی کا رنگ گل کا لگا مجھے پھیکا

دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشم کرم
لب صدف کے تر نہیں ہر چند ہے گوہر میں آب

سوچنے والے پر پوشیدہ نہیں ہے کہ پہلا مصرع اس طرح ہونا چاہیے تھا (اصلاح مؤلف):

مت رکھے چشم کرم دولت سے اپنے خور کی

گر سلیماں کا تخت دیں، مت لے کہ سب آخر کو جائے گا برباد

تیری نگاہ کی کثرت سے اے کماں ابرو
ہمارے سینہ میں تودہ ہوا ہے تیروں کا

پیا لہو پیوے ہے سو نہوڑوں سے کھووے ہے لب ہزار زوروں سے

کرے کرم اے مہرباں پھر ہم کہاں اور تم کہاں
نئیں دیکھ سکتا آسماں پھر ہم کہاں اور تم کہاں

تکلیف کھینچے حد سے زیادہ رکھے جو فیض
گو نام کو ہما ہے پہ کھاوے کیا اپنے ہاڑ

ملنے کو نوخطاں کے واعظ برا کہے ہے بھولے ہیں یہ باتیں ہم خوب جانتے ہیں

عید ہوتی تھی وہیں جو کوئی افطار کرتا جس کے گھر
اب بتاویں طے کا روزہ دیکھ کر مہمان کو

آج تو ناجی سجن سے کر تو اپنا عرض حال
مرنے جینے کا نہ کر وسواس ہونی ہے سو ہو

غم نہیں گر دلبری سے دل کو لے جاتا ہے وہ
پاس میرے تب تو آتا ہے جو دل پاتا ہے وہ

کیا فردا کا وعدہ سرو قد نے قیامت کا جو دن سنتے تھے کل ہے

ہوا جب آئینہ میں جلوہ گر تب میں لیا بوسہ
جو آیا اپنے قابو میں تو پھر منہ دیکھتا کیا ہے

موجی ہے اپنے دل کا کچھی نہ دے کہے سے
اور اب مخالفوں میں وہ بات ہی ڈبوئی

نہ جانا یہ کہ اس پہ کئی مرے ہیں   عبث کرنے گیا میں گور پر گور

نرگس کے تئیں میں ہرگز لاتا نہیں نظر میں
دیکھیں ہیں میں نے آخر پیارے تمہاری آنکھیں

دیکھ دلبر تری کمر کی طرف   پھر گیا پانی اپنے گھر کی طرف
حشر میں پاکباز ہیں ناجی   بدعمل جائیں گے سقر کی طرف

مجکو باتوں میں لگا معلوم نہیں کیا کہہ گیا
لے چلا جب دل کے تئیں منہ دیکھتا میں رہ گیا

ڈوب گئے کئی ملک جب کھولی لبِ دریا یہ زلف
حیف ناجی کو نہ پوچھا کس لہر میں بہہ گیا

اغنیا کے در بدر مقدور جب تک ہو نہ جا
سخت حاجت ہو تو جا، لاچارگی ہے جا ضرور

چاہیئے اشراف کو مفلس ہو مجلس میں نہ جا
گو کوئی بولا نہ ہو پر بوجھتے ہیں سب حقیر

جہاں دل بند ہو ناجی کا وہاں آوے خلل کرنے
رقیب لاولد ناصح گویا لڑکوں کا باوا ہے

کھنچے ہیں جب سیں دو پیارے نیں قلمیں
پڑا ہے نوخطاں کا دل خلل میں

تیور آنکھوں کے دیکھے آج اور ی
زمانہ کچھ کا کچھ پھر جائے پل میں

ل؎ نسخۂ پیرس کے حاشیہ پر یہ غزل درج ہے۔

فقط لا کفر ہے اسلام دیں پر
مسلمانی رکھی ہے حق کے کلمیں

قفس ہے شہر دیوانوں کے حق میں
بن آئی سیر مجنوں کی جنگل میں

یہ دل رسوا کرے ہے آدمی کو
بڑا دشمن ہے اے ناجی بغل میں

پیام

شرف الدین علی خاں پیامؔ۔ اپنے عہد کے فارسی گو شعرا میں مانا ہوا شاعر تھا۔ اس کے علاوہ ریختہ میں بھی صاحبِ دیوان ہے۔ اکبرآباد کی خاک پاک سے ہے۔ بندہ سے اکثر ملاقات ہوتی ہے۔ اس کے لائق تعریف بیٹے میاں نجم الدین علی المتخلص بہ سلاّم کے ساتھ حقیر کو دلی اخلاص ہے۔ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں اور فکر شعر کرتے ہیں اور باہم گپ شپ لگانے کا اتفاق رہتا ہے۔

اس کا احوال بھی لکھا جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ اس کے کلام سے ہے۔

(پیام): بات منصور کی فضولی ہے
ورنہ عاشق کو آہ سولی ہے

قطعہ

دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے   کام عشاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا   ٹوپی والوں نیں قتل عام کیا

احسن اللہ

میاں احسن اللہ۔ یہ شخص میاں آبروؔ کا ہم عصر تھا۔ اس کی طبع ایہام کی

طرف بہت مائل تھی۔ اس رجحان کے غلبے کی وجہ سے اس کی شاعری بے رتبہ رہ گئی۔ اس کے دوسرے حالات مجھ کو معلوم نہیں ہیں اس کے کلام سے ہے:

یہی مضمون خط ہے احسن اللہ
کہ حسن خوبرویاں عارضی ہے

سعادت

میاں سعادت علی، سادات امروہہ سے تعلق رکھتا تھا۔ آدمی سلیم الطبع، کم سخن، متواضع تھا۔ سعادت تخلص کرتا تھا۔ قصہ مختصر درویشی سے رغبت رکھتا۔ اس کی شاعری لطف سے خالی نہیں ہے۔ بندہ کے ساتھ بہت ربط و ضبط تھا۔ چند اشعار اس (کے کلام) سے ہیں۔ (سعادت):

کس سے پوچھوں دل مرا چوری گیا زلفوں میں رات
ایک جو شانہ ہے سو وہ تیل میں ڈالے ہے ہات

ہوش کھو دیتی ہیں میرا اس کی آنکھیں مے پرست
بسکہ ہوں کم ظرف دو پیالوں میں ہو جاتا ہوں مست

کیا صید آ ہوئے دل آسواری سے میاں تم نے
کمر کی ڈاب نہیں کھولی گویا چیتے کی ڈوری تھی

واللہ جو سر لوح تیرا نام نہ ہوتا
ہرگز کسی آغاز کا انجام نہ ہوتا

یار سے جو رقیب لڑتے ہیں   یہ ہمارے نصیب لڑتے ہیں

اہلِ زر کے سیم تن ہوتے ہیں رام
صید ہو ہیں جس جگہ دیکھیں ہیں دام

پپیہے کی طرح دارو کے شیشے   زبانِ حال سے کہتے ہیں پی پی

بے نوا

بے نوا تخلص۔ اس کا احوال تحقیق سے جوڑ نہیں کھاتا۔ محمد شاہ بادشاہ کے وقت میں سنکرن نامی جوہری نے ایک جوتی فروش کا قتل کر دیا۔ اس بابت بلوہ ہو گیا۔ چنانچہ جوتی فروشوں نے جامع مسجد میں خطبہ میں خلل ڈالا۔ ظفر خاں روشن الدولہ کہ جو طرہ باز کے نام سے مشہور تھا اس نے جوہری مذکور کو پناہ دے دی۔ آخر ہنگامہ برپا ہو گیا اور بڑے بڑے اُمرا میں بڑی جنگ چھڑ گئی۔ دونوں طرف کے بہت (لوگ) قتل ہو گئے اور ظفر خاں روشن الدولہ تاب نہ لا پایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اس سانحہ سے اس کو ایسی خفت ہوئی کہ اس کے بعد وہ گھر سے باہر نہیں نکلا۔ اس قصے کو زیر تحریر شاعر (یعنی بے نوا) نے مخمس میں باندھ دیا (یعنی موزوں کر دیا) جو ابھی تک زبانوں پر چڑھا ہوا ہے اس (کے کلام) سے ہے:

مخمس

یہ کیا ستم ہے اے فلک ہرزہ نابکار   مریخ پھر کے تیز کیا ہے خنجر کی دھار
جوتی فروش مرد مسلمان دین دار   مردود جوہری نے لیا ہے ستم سے مار
سنگِ جفا سے چور کیا لعلِ آبدار

(جوتی فروش بیچ پڑی آ کے کھلبلی   کتنوں کی کشتی ڈھیلی ہوئی اور عقل ٹلی
بے حد شمار مرحلہ سے جوتیاں چلی   کیا نئی و کیا پرانی پشوری و گھیتلی
لاہوری، سیف خانی، چرن مُنڈی، پیچ دار

کتنوں کو مار جی سے قضا نے گرا دیا   کتنوں کو جی بچا کے بہت ہڑبڑا دیا
کاغذ پہ بے نوا نے یہ سُن کر چڑھا دیا   لگتے ہی مار جوتیوں طرہ گرا دیا
تا حشر ہر زباں پہ رہے گا یہ یادگار

عطا

عالم گیر بادشاہ کے عہد میں عطا نام کا ایک اوباش گزرا ہے (دوبیت)
اس (کے کلام) سے :

اے در نبردِ حسن تو کشتہ بچار چشم　　زیر مژہ نہفتہ چو آہو بچار چشم
در کوئے عشق خواجہ عطا بھیڑ بھاڑ ہے　　تو بھی گھُسر پھُسر کرو ر بڑ کھسا چشم

جعفر زٹلی

میر محمد جعفر، جعفر زٹلی کے نام سے مشہور ہے۔ وہ اپنے وقت کا انوکھا اور اپنے دور کا عجوبہ کردار تھا۔ اس کی زبان کاٹ کھانے والی تھی۔ اچھی وضع والے اور شریف (گھرانوں کے لوگ) تمام اس کو دیکھا کرتے تھے اور ایک بات (یقین کے ساتھ) جانتے تھے کہ جب وہ کسی کے گھر آتا ہے تو (ہمیشہ) دو کاغذ ساتھ لاتا ہے۔ ایک کاغذ پر صاحب خانہ کی ہجو ہوتی ہے اور دوسرے پر اس کی مدح۔ اگر وہ اس کو متواضع پاتا تو مدح پڑھتا ورنہ ہجو والے کاغذ کو مشتہر کر دیتا، چنانچہ شاہزادہ محمد اعظم شاہ پر عالمگیر بادشاہ کے جس کو رقعات عالمگیری میں عالی جاہ کے نام سے امتیاز دیا گیا ہے، اس کی بھی ہجو کر ڈالی۔

ھجو اعظم شاہ

چہارم پسر ڈومنی کا جنا　　برج میں رہے جوں......

قصہ مختصر یہ کہ اس نے ہزل کی بہت شاعری کی۔ جب اعظم شاہ کے سامنے باریاب ہوا تو یہ شعر فی البدیہہ اس کی مدح میں کہا : ؎

مدح

نگین سلیماں کہ تابندہ بود　　ہمیں اسم اعظم بر آں کندہ بود

(سلیمانؑ کی انگوٹھی جو چمکتی تھی وہ اس لیے کہ اس پر تمام میں اسم اعظم کھُدا ہوا تھا) اس مطلع پر اس کو معقول صلہ ملا۔ چونکہ میر مذکور کے بہتیرے اشعار ہر شہر میں اور ہر گھر میں مشہور ہیں اس وجہ سے یہاں نہیں لکھے جا رہے ہیں۔

نقل ہے کہ ایک دن وہ مرزا عبدالقادر بیدلؔ کے گھر پر آیا اور مرزا (معزی الیہ) کے منہ پر یہ مصرع پڑھا :

چہ عرفی چہ فیضی بہ پیش تو پھش
(کیا عرفی کیا فیضی سب تیرے سامنے پھسپھسے ہیں)

مرزا اس کے مراد و معنی سے بہت خفا ہوئے یہاں تک کہ وہ آب دیدہ ہوگئے اور انھوں نے (اس کو) جلد از جلد رخصت کر دیا۔

سوداؔ

مرزا محمد رفیع۔ خدا اسے سلامت رکھے۔ المتخلص بہ سوداؔ۔ نوجوان ہے، خوش اخلاق اور خوش مزاج، گرم جوش، یار باش، شگفتہ چہرے والا۔ اس کا مولد شاہ جہاں آباد ہے، نوکر پیشہ ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، مخمس اور رباعی تمام اصنافِ سخن خوب کہتا ہے۔

وہ ہندی شاعروں کا سرتاج ہے، بہت خوش فکر اور اچھا کہنے والا ہے اس کا ہر شعر تکرار (کے عیب) سے خالی، لطافتِ فکر دکھانے والا، چمن بندی ہیں اس کے الفاظ گل معنی کے گلدستے، اس کا ہر مصرع برجستہ داور آزاد منش سرو (کے مانند ایستادہ ہوتا ہے)، اس کی بلند پرواز فکر کے آگے بلند طبیعتیں شرمسار، ریختہ کا شاعر (ہے)، ریختہ کی ملک الشعرائی اسے زیب دیتی ہے۔ ایک قصیدہ گھوڑے کی ہجو میں کہا ہے جس کا نام "تضحیک روزگار" ہے۔ اس میں ایسی شعری صنعتیں استعمال کی ہیں جو مقدور کی حد سے باہر ہیں۔ اس کا مطلع یہ ہے :

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بیک قرار

اکثر ساتھ ساتھ (ایک) طرح میں غزل کہنے کا اتفاق پڑتا ہے۔ الغرض مغتنم روزگار لوگوں میں سے ہے۔ حق تعالیٰ اس کو سلامت رکھے۔ اس کے کلام سے ہے:

بیکس ہوئی مرے تو جلے اس پہ دل مرا　　گویا ہے یہ چراغ غریبوں کی گور کا
ٹوٹے تری نگہ سے اگر دل حباب کا　　پانی بھی پھر پیوں تو مزا ہے شراب کا
موج نسیم گرد سے آلودہ ہے نپٹ　　دل خاک ہو گیا ہے کسی بے قرار کا
آہ کس طرح تیری راہ میں گھیروں کہ کوئی　　سدِ رہ ہو نہ سکے عمر چلی جاتی کا
زباں ہے عمر میں قاصر شکستہ بالی کے　　کہ جن نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

نہ کھینچ اے شانے ان زلفوں کو یہاں سودا کا دل ٹکا
اسیر ناتواں ہے یہ نہ دے زنجیر کو جھٹکا
پرے رہ برق خار آشیاں میرے سے کہتا ہوں
اڑے گا دھجیاں ہو کر ترا دامن جو یہاں اٹکا

سودا ہوئے جب عاشق کیا پاس آبرو کا
سنتا ہے اے دیوانے جب دل دیا تو پھر کیا

موج آتش ہے سیل آنکھوں کا　　دل کا شاید کہ آبلہ پھوٹا
نہ جیا تیری چشم کا مارا　　نہ تری زلف کا بندھا چھوٹا

پھرے ہے شیخ یہ کہتا کہ میں دنیا سے منہ موڑا
الٰہی ان نے اب داڑھی سوا کس چیز کو چھوڑا

جو گزری ہم پہ مت اس سے کہو ہوا سو ہوا　　بلاکشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر　　مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

ترا جیو مجھ سے نہیں ملتا مرا دل رہ نہیں سکتا
غرض ایسی مصیبت ہے کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا
ترے آگو سحر آنکھوں سے آنسو کیوں کہ چلتے ہیں
جو تو دریا پہ گزرے ہے تو پانی بہہ نہیں سکتا

قطعہ

تجھ بن عجب معاش ہے سودا کا ان دنوں
تو بھی ٹک اس کو جا کے ستمگار دیکھنا
نے حرف و نے حکایت و نے شعر و نے سخن
نے سیر باغ و نے گل و گلزار دیکھنا

خاموش اپنے کلبۂ احزاں میں روز و شب　　تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا
یا جا کے اس گلی کو جہاں تھا ترا گزر　　لے صبح تا بشام کئی بار دیکھنا
تسکین دل نہ اس میں بھی پائے تو بہر شغل　　پڑھنا یہ شعر گر کبھی اشعار دیکھنا
کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں تجکو غیر پاس　　پر جو خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

کسی دیندار و کافر کو خیال اتنا نہیں آتا
سحر کیا ہو چکی سودا کے جیو پر شام کیا ہوگا

سودا سے یہ کہا میں دل اس طرح سے کھونا　　کہنے لگا کہ ناداں کیا پوچھتا ہے ہونا

گل میرے مشہد پہ کب بھیجے ہے وہ ابر کماں
طرح غنچہ کے کھلے جب تک نہ پیکاں تیر کا

سودا سے میں یہ پوچھا دل میں بھی دوں کسی کو
وہ کر کے بیاں اپنی روداد بہت رویا

کیوں اسیری پر مری صیاد کو تھا اضطراب — کیا قفس آباد ہو گئے کون سے گلشن خراب

ہندو ہیں بت پرست مسلماں خدا پرست
میں پوجتا ہوں اس کو جو ہو آشنا پرست

گل رخصت بہار تھی شبنم صفت میں زور — رویا ہر ایک گل کے گلے لگ چمن کے بیچ

یا تبسم یا نگہ یا وعدہ یا گاہے پیام
کچھ بھی اے خانہ خراب اس دل کو سمجھانے کی طرح

منعم نہ مر بنائے عمارت کی فکر میں — یہ سب حویلیاں تھیں جہاں تک ہے اب اجاڑ

کتنا شگفتہ رو ہے کہ مانند آرسی
چھاتی کے جس کے روبرو کھل جائیں ہیں کواڑ

گزری جس غم سے مجھے زندگی دو روزہ — رکھے اس غم کو خدا شہر محرم سے دور

قطعہ

عقل نیں ایک دن آ کر یہ کہا سودا سے — خواہ نزدیک ہمارے رہو خواہ ہم سے دور
لیکن اتنا ہے کہ وہ کام نہ کریو پیارے — جس کا ثمرہ رکھے تم کو دل عالم سے دور

انکار قتل سے تو کرے ہے سجن ہنوز — میلا نہیں ہوا ہے ہمارا کفن ہنوز
کس کے ہیں زیر زمیں دیدۂ نمناک ہنوز — جا بجا سوت ہیں پانی کے تہ خاک ہنوز
سودا کا تو نے حال نہ دیکھا کہ کیا ہوا — آئینہ لے کے آپ کو دیکھے ہے تو ہنوز

اے لالہ گو فلک نے دیے تجھ کو چار داغ
چھاتی مری سراہ کہ اک دل ہزار داغ

کون کہتا ہے مت اوروں سے ملا کر مجھ سے مل
جس کے ملنے پر خوشی تیری ہو مل پر مجھ سے مل

رنگ گل بے طرح دہکے ہے سن اے ابر بہار
آشیاں میرا چھڑک لگتی ہے اب گلشن کو آگ

قاتل کے دل سے آہ نہ نکلی ہوس تمام — ذرہ بھی ہم تڑپنے نہ پائے کہ بس تمام

تسلی اس دیوانے کی نہ ہو بھولی کے پتھروں سے
اگر سودا کو چھیڑا ہے تو لڑکو مول لو پھڑیاں

ظاہر میں دیکھنے کا کچھ اسباب ہی نہیں — آوے مگر تو خواب میں سو خواب ہی نہیں

مجکو نہیں ہے دل میں ترے راہ کیا کروں
پر بے اثر ہے عشق مرا آہ کیا کروں

یہ کس کی ہیں چمن میں صبا بد شرابیاں — ٹوٹی پڑی ہیں غنچوں کی ساری گلابیاں

نہ پوج سنگ و گل اے شیخ اس صدا کو مان
مرے صنم کی پرستش کر آ خدا کو یاں

نہ غنچے گل کے کھلتے ہیں نہ نرگس کی کھلی کلیاں
چمن میں لے کے خمیازہ کنھی نیں انکھڑیاں ملیاں

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں
دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں

بلبل خاموش ہوں جوں نقش دیوار چمن
نے قفس کے کام کا ہر گز نہ در کار چمن

نوک سے کانٹوں کی ٹپکے ہے لہو اے باغباں
کس دل آزردہ کے دامن کش ہیں خار چمن

جیو تک تو دے کے لوں جو تو ہو کار گر کہیں
اے آہ کیا کروں نہیں بکتا اثر کہیں

ہوتی نہیں ہے صبح نہ آتی ہے مجکو نیند — جس کو پکارتا ہوں سو کہتا ہے مر کہیں
جادو بھری ہیں چشم تنک آئینہ کو تو دیکھ — دھڑکے ہے دل مرا کہ نہ پلٹے نظر کہیں

غیر کے پاس یہ اپنا نشاں ہے کہ نہیں
جلوہ گر یار مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں

جرم ہے اس کی وفا کا کہ جفا کی تقصیر
کوئی تو بولو میاں منہ میں زباں ہے کہ نہیں
دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

اس درد دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو
قسمت میں جو لکھا ہے الٰہی شتاب ہو
اس کشمکش سے دام کی کیا کام تھا مجھے
اے الفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو

بہارِ باغ ہو مینا ہو جام صہبا ہو
ہوا ہو ابر ہو ساقی ہو اور دنیا ہو
روا ہے کچھ تو بھلا اے سپہرِ نا انصاف
ریا سے زہد چھپے راز عشق رسوا ہو
جو مہرباں ہیں سودا کو مغتنم جانیں
سپاہی زادوں سے ملتا ہے دیکھیے کیا ہو
الٰہی ہے سکت نعم البدل کی تجھ کو دینے کی
مجھے اس کا عوض تو کچھ نہ دے پر پھیر دے دل کو
بوؤں میں تخم گل کو جہاں زقوم ہو
پالوں جو عندلیب قفس میں تو بوم ہو
اپنے چمن کو فائدہ کیا تجھ سے اے نسیم
یہ جلا ہے وہ کہ یہاں دمِ عیسیٰ سموم ہو
کعبہ کی زیارت کو اے شیخ میں پہنچوں گا
مستی سے مجھے بھولی جس دن رہِ مے خانہ
مت ہنس مرے رونے پر، آمان میں کہتا ہوں
ٹپکے ہے ابھی کوئی قطرہ اثر آلودہ

نسیم بھی ہے چمن میں اور اب صبا بھی ہے
ہماری خاک سے پوچھو تو کچھ رہا بھی ہے
قدم سنبھال کے رکھ خار دشت پر مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے
سودا جہاں میں آ کے کوئی کچھ نہ لے گیا
جاتا ہوں ایک میں دل پر آرزو لیے

غیرت عشق آن کر سودا تو پروانوں سے سیکھ
شمع سے اپنا ہی ملنا دیکھ جل جاتے ہیں وہ

کس قدر اب کے ہوا مست ہے ویرانہ کی
کسی لڑکے کو نہیں شدھ کسی دیوانہ کی
سودا کو جرم عشق پہ کرتے ہیں آج قتل
پہچانتا ہے تو یہ گنہ گار کون ہے
بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے
اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے

اس حال کے نبھنے کا کچھ اسلوب نہیں ہے
یہ کج روشی ہم سے فلک خوب نہیں ہے
کہتا تھا بناگوش تری زلف کے آگے
میں صبح قیامت ہوں مری شام یہی ہے
قاصد کے تئیں میں اپنے جو کچھ کہوں بجا ہے
جیتا پھرے تو اجرت ورنہ یہ خوں بہا ہے
جس دن تیری گلی کی طرف ٹک پون بھی
میں آپ کو جلا کے کروں خاک تو سہی

پہنچی نہ آہ تجھ کو مرے حال کی خبر
قاصد گیا تو ان نے بھی اپنی ہی کچھ کہی
عشرت سے دو جہاں کی یہ دل ہاتھ دھو سکے
تیرے قدم کو چھوڑ سکے یہ نہ ہو سکے
جس سرزمیں پہ جا کے روؤں تیری یاد میں
دہقاں کچھ اس زمیں میں بجز دل نہ بو سکے
نہ ضرر کفر کو نہ دین کا نقصاں مجھ سے
باعث دشمنی اے گبر و مسلماں مجھ سے
اس کی خو سے نہیں محرم انھیں رونے سیتی کام
کیا کیا چاہتے ہیں دیدۂ گریاں مجھ سے
آگیا رات میں جو دزد حنا تیرے ہاتھ
ورنہ جا پاؤں کو لاگا ہی تھا چوری چوری

تجھ تیغ تلے کہہ تو ستم سے کہ سر دھر دے   پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کا رے دہر مر دے
دل کے تئیں اک عالم کہتا ہے خدا کا گھر   اے عشق اسے آتش دے ہے تو سمجھ کر دے
کھلنے تو لگا ہے دل چوں غنچہ ہمارا بھی   لیکن نہ صبا تجھ سے گا ہے بدم سر دے

سینہ کو رستموں کے نگہ تیری توڑ دے   آنکھوں کی ہر پلک صف محشر کو موڑ دے

مرجاں کا نخل ہوں نہ پھلوں برگ و بار سے   ٹپکے ہمیشہ خون مری شاخسار سے
خنجر طلب ہے مرگ سے ہر آہوئے حرم   دل پھر گیا ہے کس کی مژہ کا شکار سے

زاہد چلا ہے کعبہ کو اور برہمن کنشت   بندہ ہیں اس کے ہم جو کسی دل میں گھر کرے
جگ میں شراب خور کی تشہیر کے لیے   سودا جو محتسب ہو تو زاہد کو خر کرے

دولاب کی ہے حق بطرف مستی سے فریاد   پیمانہ کسی کے گلے کا ہار نہ ہووے
ہر دست خدائی میں تو یہ کیجیے منادی   ظالم ہو جو کوئی سو طرحدار نہ ہووے
کر ذبح شتابی مجھے صیاد کہ یہ صید   ہاتھوں ہی میں تیرے کہیں مردار نہ ہووے
میں کہتا ہوں دل اپنے سے کہ ننگ و نام سے گزرے
نہ ہوں گر اس میں یہ باتیں تو کیا آرام سے گزرے
مومن نہیں زنار سے میرے آگاہ   اس رشتہ کو ہے سبحۂ اسلام میں راہ
اس بت کا برہمن ہوں کہ صوفی یا شیخ   کہتے ہیں جسے دیکھ کے اللہ اللہ

جناب[1] پاک مرتضوی صلوٰۃ اللہ علیہ کی منقبت میں کہا ہے:

رُباعی

ایوان عدالت میں تمہارے یا شاہ   کچھ ظلم کو ہے دخل عیاذاً باللہ

[1] پیرس: در منقبت..... آں نفس رسول زوج بتول مظہر الغرائب و مظہر العجائب اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب صلوٰۃ اللہ و سلامہ گفتہ۔

شیشہ کا جو وہاں طاق سے پٹکے پائی   پتھر سے نکلتی ہے صدا بسم اللہ

کلیم

نام محمد حسین، کلیم تخلص، شاہ جہاں آباد سے ہے۔ ایک شخص سپاہی پیشہ ہے۔ ریختہ میں اپنی وضع کا مانا ہوا شاعر ہے۔ صاحب دیوان ہے جس میں قصائد، مخمس اور رباعیات ہیں۔ اس کی طرز کسی اور کی طرز کے مماثل نہیں ہے۔ بیشتر وہ مرزا بیدل کی زبان میں بات کرتا ہے اس کے تہہ دار شعر کو سمجھنے میں عاجز الکلاموں کی قوتِ فکر اپنی عاجزی کا اظہار کرتی ہے اور اس کی طبع رواں (تیز) دھارے کی مانند بہتی ہے اور اس کی فکر رسا آسمان کے اس پار جاتی ہے۔ اس کی فکر کا بازو معنی کی کمان کو زور سے کھینچتا ہے۔ اس کے پیچدار اور پُرتا ثیر اشعار تیر کا کل رُبا ہیں۔

حالانکہ کلیم (نامور شاعر) فارسی میں گزر چکا ہے لیکن ریختہ کا کلیم فقیر کے نزدیک یہ ہے۔

قطع نظر اس کے کہ بندہ کو اس کی خدمت میں بہت قربت حاصل ہے تہہ دل سے اخلاص کا رشتہ ہے۔ حق تعالیٰ اس کو سلامت اور شاد کام رکھے، محمدؐ اور ان کی آل کے تصدق میں۔ اس کے کلام سے ہے:

آتی ہے دل پہ قلقل مینا سے اب شکست
وے دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

درازیٔ شب ہجرانِ زلف یار کلیم   نہ مجھ سے پوچھ کہ کاٹی ہے رات آنکھوں میں

ہو چکی حشر گئی دوزخ و جنت میں خلق
رہ گیا میں ترے کوچے میں گرفتار ہنوز

ہر تار پیچ زلف کے عالم کی جان ہے   گویا یہ اژدہا تھا کہ سب کو نگل گیا
قربان اس اکڑ کے عجب یہ مروڑ ہے   آشفتہ ہوگئیں پہ نہ زلفوں سے بل گیا

میں بانکپن سے تیرے نہیں ڈرنے کا رقیب
گر دل میں ہے تو مجکو بھی للکار دیکھنا

لیا رقیب پردہ در کے آج میں ماری ہے میخ
حلقۂ در کے نمط گھر سے اسے بیروں کیا

نہ کچھ تیرا ہوا پرویز کا نہ شیریں کا — ترے ہی سر پڑا اے فرہاد جو ہوا سو ہوا

نشاں مجھ دل کا مت پوچھو یہ مجنوں
کہیں اس طرف ویرانے کے ہوگا

نقاب اپنے رخ کا جو تو باز کرتا — تو گل اپنی خوبی پہ کیا ناز کرتا
وفا کا ہوں پر بستہ نہیں توڑ پنجرا — چلا جاتا جنگل کو پرواز کرتا

تجھے برق خار سے کام کیا جو حیا ہے حق کو تلف نہ کر
یہ ازل کے دن سے نصیب ہے کف پائے آبلہ دار کا

لگا جب غیر سیتی ہم طبق ہونے وہ مہماں کش
وہ اپنے ہاتھ دھوتا تھا، میں اپنے ہاتھ ملتا تھا

کیا ہوا زلف سے گرہ کھولی — میرے سر کا تو یہ گرہ نہ گیا
قبر میں بھی لیے ہمراہ گیا اپنے کلیم — آہ کیوں درد دل اپنا نہ کسی کو سونپا

وہی ایک ہے جو ان دونوں گھروں میں خلق ڈھونڈے ہے
پس اے زاہد اگر مسجد سے بت خانہ ہوا تو کیا

سر بھی ہے تیغ بھی ہے لگانا ہے تو لگا — کہیو نہ جان پھر کے کہ یہ جیو چھپا گیا

تا صبح تجھ بغیر عجب میرا رنگ تھا — روشن تھی شمع آہ دل اس پر پتنگ تھا

زبان موج سے یوں بحر کہتا تھا حبابوں سے
کہ اپنا سر ہی کھاتا ہے جہاں میں جن نے سر کھینچا

اے شمع تیری باری ہے شب کو کہ شام تک — اپنے دنوں کو جتنا میں رونا تھا رو چکا

عمر رفتہ کا نہ پایا کھوج ہرگز اے کلیم — آپ کو جوں شمع میں ہر انجمن میں گم کیا

تو نہ آیا باغ میں شمشاد غم سے خم ہوا — طوق قمری کا فغاں سے حلقۂ ماتم ہوا

کس پریشانی میں قدم رکھا ہے پیچ و تاب سے — جادہ آتا ہے نظر جوں زلف کچھ برہم ہوا

وہ نازک تن لطافت سے کسی کو نہیں نظر آتا
مقرر ایک جا تو ہے نہ کیا جانے کہاں ہوگا

وہی دیر و وہی بت وہی مالا — یہی انشاء اللہ تعالیٰ

چھپا ہے آ مری چشم پر آب میں دریا — کہیں نہ دیکھا ہے اب تک حباب میں دریا

پاس ناموس محبت ہے مجھے از بس کلیم
باغ میں جاؤں نہ ہرگز بے رضائے عندلیب

دنیا نہ کر جوانوں سے یہ بوڑھا چوچلا — مدت سے ہم تو چھوڑے پھریں ہیں تجھے نپٹ

ہمیں تو پاؤں پر بھی سر کے رکھنے کو نہ فرمایا
ملیں ہم خاک میں اور یہ ترا دامان یا قسمت

رکھتا ہے زلف یار کا کوچہ ہزار پیچ — اے دل سمجھ کے جائیو ہے راہ مار پیچ
برق نظارہ سے از بسکہ جلا ہوں نکلے — نگہ گرم جو کوئی ڈھونڈے مری خاکستر
لالہ و گل سے مجھے کام کیا میری وحشت — مجھ او پر لائی ہے یک رنگ سے رنگ دیگر
زلف کو خواب میں دیکھا تھا جنوں سے شب کو — صبح بیدار ہوا پائی گلے میں زنجیر
بوسہ تو کچھ نہ تھا اے مری جان اس قدر — تس پر رہے ہو ہم سے برا مان اس قدر
سوز غم کھا چکا ہے دل اس پر جگر جلا — کہتا ہے مجکو زخم ہے اک آرزو ہنوز

جو صدا آتی ہے اس وادی سے ہے سینہ خراش
یہ کوئی دل روتا جاتا ہے نہیں بانگ جرس

ہم گم ہوئے ہیں ضعف سے جوں بو میان باغ
پھرتا ہے رنگ گل کہ ہمارا کرے سراغ

جوں کعبتین گھر میں مرے گل ہی سے بساط
یک مشت استخواں ہوں او رشش جہت سے داغ

جو دینا تھا مانگے بغیر از دیا ہے — کٹے وہ زباں جو کہ اس پر ہو سائل

پوچھ مت غم کی داستاں اے دل — کہ پڑا ٹوٹ آسماں اے دل

ہم سے پوچھو ہو پیوتے ہو شراب — ایسے کیا شیخ و پارسا ہیں ہم
تم جام دو پیارے کیونکر کریں نہیں ہم — خونِ جگر تھا تو بھی پی ہی گئے دو ہیں ہم

تو یار مل کے ہم سے جب ایک ہو گیا ہو — کس کو بعید مانیں کس کو کہیں قریں ہم
تم ہو تو ہم کہاں ہیں، ہم ہیں تو تم کہاں ہو — یا تم ہی سب ہو ہم میں یا سب کے سب ہمیں ہم

طریق عشق میں مجنوں و کوہ کن کے نہ کہہ — ہزاروں ہو گئے غارت سو ایک دو معلوم

مانند سرو ہوں کہ نہ گل ہے نہ بر مجھے — بیکار باغ ہوں نہ سزاوار باغ ہوں

جب اصل مذاہب کو واعظ سیتی ہم پوچھا — تب ہم سے لگا کہنے قصّہ و حکایاتیں
رنگ اڑا مرجھا گیا اور جھڑ پڑا شرمندہ ہوا
تجھ سیتی گل پر ہوئی کیا کیا خرابی باغ میں

قطعہ

جمعہ کو کہتا تھا واعظ سے کھڑا رندِ مست
کچھ نظر میں تجھے بھی سود و زیاں ہے کہ نہیں
یہ سخن ہے کہ نہ پی مے سو وہاں پیوے گا
یہاں تو پی لیجیے کیا جانے وہاں ہے کہ نہیں

نے و طنبور میں یہ سوز تو معلوم اے مطرب — کسی کا دل ہوا ہے شاید اس پردہ میں آ نالاں

کسی سے کبھی نہ ملیے ایک گوشہ میں پڑے رہیے
یہ فرصت یہاں تو نہیں ملتی ہے مر جانے میں ہو تو ہو

تیر ہے یا ساں ہے تیری نگاہ — ہو گئی پار مجھ جگر کے آہ

تری جناب میں آیا ہوں یا الٰہ نہ پوچھ
یہی کہ بخش دے اور مجھ سے کچھ گناہ نہ پوچھ

کوئی گل کا میں عاشق نہیں یہ داغ مجھے بس ہیں
جاتا ہوں میں گلشن سے بلبل نہ ہو آزردہ

اب دم شمردگی سے مجھے کاروبار ہے — ہر دم مرے حساب میں روز شمار ہے

غرورِ حسن ممکن نہیں کسی کی داد کو پہنچے
غرض تم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے

تو اے بارانِ رحمت اوج میں آ موج سے اپنی
کہ یک قطرے میں میری کشت کا بھی کام ہو جاوے

جہاں میں یہ میں نہیں جانتا کہاں تو ہے
پر اتنا جانوں ہوں سب تجھی ہے جہاں تو ہے

میں کہتا تھا ساقی ایاغ اب کہاں ہے — نپٹ دیر کے تئیں دماغ اب کہاں ہے
اس کے ابرو کی اگر تصویر کھینچا چاہیے — اول اپنے قتل پر شمشیر کھینچا چاہیے

دل پھر رہا ہے آبلۂ پا کی جوں کلیم
جُز خارِ دشت کے میرا غم خوار کون ہے

رُباعی

گل رو تو چمن میں اچپلی سے نہ گیا — یہ دل بھی کلی سے بے کلی سے نہ گیا
جو کوئی کہ گیا چھوڑ گیا دل کو یہاں — کوئی دل سے تری گلی سے نہ گیا

ہر چند لگاتے ہیں بتاں گل مہندی — تیرے ہی قدم تلے گئی رُل مہندی
ہیہات ہیہات کیسا ہو گا وہ ہات — جس ہاتھ سیتی داغ ہوئی گل مہندی

میر دَرد

میاں صاحب میاں خواجہ میر۔ خدا تعالیٰ اس کو سلامت رکھے۔ دَرد تخلص ہے۔ گلستانِ شاعری کا جوشِ بہار۔ اِس فن کے باغ کا خوش الحان بلبل ہے۔ اس کی گفتگو کی زبان مدعا کی شام کی زلف کی گرہ کو کھولنے والی کاغذ کے صفحہ پر اس کا مصرع گویا دل کش صبح کا کاکل، اس کے طبع سخن کی پرواز اسلوب کے چمنستان کا بلند ہوتا ہوا سرو ہے۔ کبھی تلاش کے باغ میں

چل قدمی کے ڈھب سے قدم رنجہ فرماتا ہے۔ اس کی شاعری کے چمن میں ہر چپہ پر رنگین الفاظ ہیں۔ خیال کے خریدار (شوقین) اس کے گلہائے معنی سے اپنے اپنے دامن بھر سکتے ہیں۔ ریختہ کا زوردار شاعر، موضوع میں ڈوبا ہوا ہے۔ آدمی خلیق، متواضع اور دوست صحیح ہے۔

فارسی کی شاعری بھی بہت عمدہ، مربوط اور رنگین کرتا ہے۔ لیکن اس کی بیشتر رباعیات عوام الناس کی دل چسپی کی اور وسیع المشربی کی ہیں۔ الغرض (ہم کو تو) اس کی دوستی سے مطلب۔

وہ شاہ جہاں آباد کا رہنے والا ہے۔ صاحب بزرگی ہے اور بزرگ زادہ بھی ہے، صالح جوان اور تقویٰ گزار ہے۔ درویشی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ فقیر کو اس ذات گرامی کی خدمت میں خاص شناسائی حاصل ہے۔ یوں تو اس کا حسن سلوک عام ہے مگر حسن سلوک کا سر اس کے پاؤں پکڑے ہوئے ہے، غرور کو گوشۂ دل سے محو کر دیا ہے۔ یعنی مٹا دیا ہے

حضرت خواجہ ناصر صاحب کا سچا فرزند (خواجہ میر درد) خدا اس کو سلامت رکھے کہ ایک عالم کا پیشوا ہے۔ ایک دن فقیر اس بزرگوار کی خدمت کا شرف اٹھا رہا تھا کہ اس نے اپنی زبان مبارک سے فرمایا کہ "میر محمد تقی تو میرِ مجلس ہوگا": الحمد اللہ والمنۃ کہ اس کی یہ بات خدا پرستوں پر اثر انداز ہوئی اور اس کا باطن اہل معرفت کے قافلہ کا خضر (یعنی راہ دکھانے والا) ہے کہ اس پاک (بزرگ) سے بالکل ظاہر ہے۔ اس (کی بات) نے فوری کام کیا اور ریختہ کا جلسہ جو بندہ کے مکان پر ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو ہونا مقرر ہے دراصل اس کی ذات سے ہی وابستہ ہے کیونکہ اس سے پہلے یہ مجلس اس کے مکان پر مقرر تھی۔ بے مدار زمانہ کی گردش سے وہ جلسہ برہم ہوگیا۔ اس لیے کہ وہ اس حقیر کے ساتھ دلی محبت رکھتا تھا بولا کہ "اس مجمع (کے جلسہ) کو تم اگر اپنے مکان پر مقرر کر ڈالو تو اچھا ہے": اس مہربان کی محبت پر نگاہ کر کے عمل کر دیا گیا۔ خدا تعالیٰ اس کو ابد الآباد تک زندہ و سلامت رکھے۔ یہ اشعار اس کے کلام سے ہیں:

(درد کی شاعری)

کبھو خوش بھی کیا ہے جیو کسی رند شرابی کا
بھڑا دے منھ سے منھ ساقی ہمارا اور گلابی کا

بجھے شعلے بھی کتنے، کتنی ہی موجیں مٹیں یارب
کبھو دل کی بھی ہوگا کام آخر اضطرابی کا

شرار و برق کی سی بھی نہیں یہاں فرصت ہستی
فلک میں ہم کو سونپا کام جو کچھ تھا شتابی کا

زمانہ کی نہ دیکھی جرعہ ریزی درد کچھ تو نہیں
ملایا مثلِ مینا خاک میں خوں ہر شرابی کا

اکسیر پر (اے) مہوس اتنا نہ ناز کرنا
ہے کیمیا سے بہتر دل کا گداز کرنا

ہم جانتے نہیں ہیں اے درد کیا ہے کعبہ
جیدھر پھریں وہ ابرو اودھر نماز کرنا

جگ میں آکر ایدھر اودھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

جان سے ہو گئے بدن خالی
جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا

نالۂ فریاد آہ اور زاری
آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا
کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

دیکھیے غم سے اب کے جیو میرا
نہ بچے گا، بچے گا کیا ہوگا

دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں
کوئی غنچہ کہیں کھلا ہوگا

قتل سے میرے وہ جو باز رہا
کسی بدخواہ نے کہا ہوگا

دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

عاشق بے دل ترا یہاں تک تو جیو سے سیر تھا
زندگی کا اس کو جو دم تھا دمِ شمشیر تھا

کی تو تھی تاثیر آہِ آتشیں نے اس کو بھی
جب تلک پہنچے ہی پہنچے خاک کا یہاں ڈھیر تھا

حرص کرواتی ہے روبہ بازیاں سب ورنہ یہاں
اپنے اپنے بوریئے پر جو گدا تھا شیر تھا

شیخ کعبہ ہو کے پہنچا ہم کنشتِ دل میں ہو
دردؔ منزل ایک تھی ٹک راہ کا ہی پھیر تھا

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا
تو اک دن مرا جی یوں ہی جاتا رہے گا

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا

خفا ہو کے اے دردؔ مر تو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

تو اپنے دل سے غیر کی اُلفت نہ کھو سکا
میں چاہوں اور کو تو یہ مجھ سے نہ ہو سکا

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

جوں شمع روتے روتے ہی گزری تمام عمر
تو بھی تو دردؔ داغ دل اپنا نہ دھو سکا

انداز وہ ہی سمجھے مری دل کی آہ کا
زخمی جو کوئی ہوا ہو کسی کی نگاہ کا

ہرچند فسق میں ہیں ہزاروں ہی لذتیں
لیکن عجب مزا ہے فقط جی کی چاہ کا

دل اس مژہ سے رکھیو نہ تو چشم راستی
اے بے خبر بُرا ہے یہ فرقہ سپاہ کا

شاہ و گدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں
نہ تاج کی ہوس نہ ارادہ کلاہ کا

تو ہی نہ اگر ملا کرے گا
عاشق پھر جی کے کیا کرے گا

اپنی آنکھوں میں اس کو دیکھوں
ایسا بھی کبھی خدا کرے گا

مژگانِ تر ہوں یا رگِ تاک بریدہ ہوں
جو کچھ کہو سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی
افتادہ ہوں پہ سایۂ قدِ کشیدہ ہوں

اے دردؔ جا چکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غم زدہ تو قطرۂ اشک چکیدہ ہوں

نہ ملئے یار سے تو دل کو کب آرام ہوتا ہے
وگر ملئے تو مشکل ہے کہ وہ بدنام ہوتا ہے

یہ حسن و عشق مل سمجھیں گے یا آپس میں خوں ہوگا
پر ان دونوں کے جھگڑے میں میرا کام ہوتا ہے

یارب سپہر اتنی تو اب درگزر کرے
کوئی خانماں خراب کسو دل میں گھر کرے

نہ خانۂ خدا ہے نہ ہے یہ بتوں کا گھر
رہتا ہے کون اس دلِ خانہ خراب میں

میں اور مجھ سے دردؔ خریداری بتاں
ہے ایک دل بساط میں سو کس حساب میں

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک دم میں یہ کثرت نمائیاں
گر آئینہ کے سامنے ہم آ کے ہو کریں

ہرچند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول
منہ پھیرے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جا ابھی
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر
اے دردؔ آ کے بیعتِ دستِ سبو کریں

اس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں
پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

آ جائے ایسے جینے سے اپنا تو جی بتنگ
جیتا رہے گا کب تلک اے خضر مر کہیں

مدت تلک جہان میں ہنستے پھرا کیے
جی میں ہے خوب روئیے اب بیٹھ کر کہیں

پھرتے تو ہو بنائے سج اپنی جدھر تدھر
لگ جاوے دیکھیو نہ کسی کی نظر کہیں

ایک دل سو وہ بھی ہو ہی چکا صرفِ داغ سب
بہتا پھرے ہے خوں میں کہیں کا جگر کہیں

قطعہ

پوچھا میں دردؔ سے کہ بتا تو سہی مجھے
اے خانماں خراب ترا بھی ہے گھر کہیں

کہنے لگا مکان معیّن فقیر کو
لازم ہے کیا کہ ایک ہی جاگہ ہو ہر کہیں

درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست
تو نے نہیں سنا ہے یہ مصرع مگر کہیں

مست ہوں، پیرِ مغاں کیا مجھ کو فرماتا ہے تو — پائے بوسِ خم کروں یا دست بوسی سبو
ٹال دینا اس کو نت ہر طرح جو قبلہ نما — پھر مجھے ہر پھر کے آ رہنا اسی کے رو برو

ربط ہے نازِ بتاں کو تو مری جان کے ساتھ — جی ہے وابستہ مراں کی ہر ایک آن کے ساتھ
اپنے ہاتھوں ہی کے میں زور کا دیوانہ ہوں — رات دن کشتی ہی رہتی ہے گریبان کے ساتھ
گر مسیحا نفسی ہے یہ ہی مطرب تو خیر
جیو ہی جاتے ہیں چلے تیر ہر ایک تان کے ساتھ

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی — ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی
دید و وادید ہوئی دور سے میری اس کی — پر جو میں چاہا تھا وہ بات نہ ہونے پائی

قطعہ

اٹھ چلے شیخ تم مجلس رندوں سے شتاب — ہم سے کچھ خوب مدارات نہ ہونے پائی
جی میں مرکوز جو تھی آپ کی خدمت گاری — سو تو اے قبلۂ حاجات نہ ہونے پائی

فرصت زندگی بہت کم ہے — مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے
دین و دنیا میں تو ہی ظاہر ہے — دونوں عالم کا ایک عالم ہے
اپنے نزدیک باغ میں تجھ بن — جو شجر ہے سو نخلِ ماتم ہے
درد کا حال کچھ نہ پوچھو تم
وہی رونا ہے نت وہی غم ہے

مزا جی ہے جب تک تری جستجو ہے — زباں جب تلک ہے یہی گفتگو ہے
تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا — تیری آرزو ہے اگر آرزو ہے
غنیمت ہے یہ دید و وادید یاراں
جہاں آنکھ مند گئی نہ میں ہوں نہ تو ہے

روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یہاں مجھے — اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

لے گل تو رخت باندھ اٹھاؤں میں آشیاں — گل چیں تجھے نہ دیکھ سکے باغباں مجھے
پتھر تلے کا ہاتھ ہے غفلت کے ہاتھ دل
سنگِ گراں ہوئی ہے یہ خوابِ گراں مجھے

آنکھوں کی راہ ہر دم اب خون ہی رواں ہے
جو کچھ ہے دل میں میرے منہ پر مرے عیاں ہے
آہوں کی کشمکش میں کہیں دیکھیو نہ ٹوٹے
تارِ نفس سے اے دل وابستہ میری جاں ہے
یہ راہ خاکساری میں سر سے قطع کی ہے
نقش جبیں ہے میرا ہر نقشِ پا جہاں ہے
مت موت کی تمنا اے درد ہر گھڑی کر
دنیا کو دیکھ تو سہی تو تو ابھی جواں ہے

کب ترا دیوانہ آوے قید میں تدبیر سے
جوں صدا نکلا ہی چاہے خانۂ زنجیر سے

درد اپنے حال سے تجھے آگاہ کیا کرے — جو سانس بھی نہ لے سکے سو آہ کیا کرے
فرسودگی ہے رشتۂ تسبیح کا حصول — دل میں کسو کے آہ کوئی راہ کیا کرے
دل دے چکا ہوں اس بت کافر کے ہاتھ میں — اب میرے حق میں دیکھیے اللہ کیا کرے
ماہی سے کچھ نہ ہووے بیاں شست کی خلش
جو سانس بھی نہ لے سکے سو آہ کیا کرے

گر خاک مری سرمۂ ابصار نہ ہووے — تو کوئی نظر قابلِ دیدار نہ ہووے
پھر موت کسو طرح سے نزدیک نہ پھٹکے — دنیا میں یہ جینے کا جو آزار نہ ہووے
گزرے نہ ترے سامنے سے کوئی کہ دو ہیں — شیشہ کی طرح دل کی نگہ پار نہ ہووے
دل دیسے ستم گار سے اظہار محبت
ایسا کہیں پھر دیکھیو زنہار نہ ہووے

دیکھ لوں گا میں اسے دیکھیے مرتے مرتے — یا نکل جائے گا جی نالہ ہی کرتے کرتے

لاگلابی دے مجھے ساقی کہ یہاں مجلس ہی   خالی ہوئی جائے ہے پیمانہ کے بھرتے بھرتے

دردؔ جوں نقش قدم تھا سرِ راہ اس کے
مٹ گیا اوروں کے ہی پاؤں کے دھرتے دھرتے

اپنے بندوں پہ جو کچھ چاہو سو بے داد کرو
یہ نہ آجائے کہیں جیو میں کہ آزاد کرو

کوئی دم جو چپ رہا تھا میں جانا کہ مر گیا
اے وائے دردؔ تو نہیں پھر اب نا دسر کیا

ساقی ہوائے ابر میں رو رو کے تجھ بغیر
ایسا ہوا کبھی نہ کہ دامن نہ تر کیا

وحدت نے ہر طرف تیرے جلوے دکھا دیئے   پردے تعینات کے جو تھے اٹھا دیئے
یارب تھی کیا خرام وہ جن نے ایک آن میں   کتنے ہی مُردے حشر سے آگے چلا دیئے

سیلاب اشک گرم نے اعضا میرے تمام
اے دردؔ کچھ بہا دیئے اور کچھ جلا دیئے

سجّاد

میر سجّاد، اکبر آباد سے ہے۔ آدمی علم کی طلب رکھنے والا اور مستعد ہے۔ ریختہ کا عمدہ شاعر ہے۔ میاں آبروؔ کا شاگرد ہے اور سجّادؔ تخلص کرتا ہے، انسان بہت اچھا ہے اور اس کا کلام استادی کے درجے تک پہنچ چکا ہے۔ بہت اچھی طرح کہا گیا اور معنی رکھنے والا ہے۔ یوں تو (اس کے) لفظوں کے دروبست میں تازہ کاری (ہے) لیکن اس کے نوک قلم پر معنی کی فوجیں موجود رہتی ہیں۔ (اس کا طب و لہجہ ہرکس و ناکس والا نہیں ہے (یعنی خاص خصوصیت کا حامل ہے) اس کے سامنے جب سفید کاغذ لایا جاتا ہے (تو) تلاشِ چمن میں سرگرداں، اس کی فکر رنگیں (نمونہ چمن کے لیے) ابر بہار کا سایہ بن جاتی ہے (اور چمن بندی کرتی ہے) اس کا ہر مصرع بندش (کے لحاظ سے) چنار کا لطف پیدا کرتا ہے اور (اس کی) ہر بیت، بحر خفیف میں جگر پر نوکیلے

نشتر لگاتی ہے۔ اس کے بیان کی زبان لطافت (کی بنا پر) شاعری کی رگِ جاں (کا حکم رکھتی ہے)۔ بے انصافی کی بات اور ہے (کہ کوئی اس کی خوبیوں کو نظر انداز کرے) ورنہ اس کے شعر کی تہہ داری نمایاں ہے۔ جو اس کی موشگافانہ طبیعت سے واقفیت رکھتا ہے (یہ بھی جانتا ہے کہ) اس کا شعر موئے آتش دیدہ کے مانند پیچدار اور سوختہ ہوتا ہے۔

گذشتہ میں اس کے مکان پر دوستوں کا جلسہ اور ریختہ خوانی کی محفل ہو چکی ہے۔ بندہ بھی جا چکا ہے۔ فی الحال بعض حادثات کے سبب دونوں جانب سے ملنا جلنا ایک حد تک کم ہو گیا ہے۔ خدا اس کو سلامت رکھے۔ (اس کے کلام) سے ہے:

کافروں سے داد نہ چاہو کہ یہاں کوئی
مر جا ستم سے ان کے تو کہتے ہیں حق ہوا

اگرچہ باطل، باطل ہے لیکن پہلے مصرع میں کافر کی جگہ باطل زیادہ مناسب ہے۔

گر تیرے کل کے آنے میں کھوئے نہیں حواس
سجّادؔ کیوں پھرے ہے سجن آج فق ہوا

ساقی بغیر جام کے جیو کا بچاؤ نہیں   جیوں فیل مست آوے ہے ابر سیہ بلا

کیوں مشت گل بھی دل کی نہ رونے میں بہہ گئی
سجّادؔ مجھ کو باقی ہے چشموں سے یہ گلا

غم نہیں گر گم ہوا بالوں میں تیرے جا کے دل
پیچ پر تجھ زلف کے گویا کہ اس کو بل دیا

تجکو اے سجّادؔ غیر از خنجر بیداد کے
اور بھی کچھ ظالموں کی دوستی نے پھل دیا

جو دل ہو گلوں سے اٹکتا ہوا   وہ کانٹا ہے جیو میں کھٹکتا ہوا
بُتاں تو چاہتے سجّادؔ تجکو   کریں پر کیا خدا نے جو نہ چاہا

گر ٹک زمیں پہ بونڈے کی پیٹھ کو لگا دیں
جانیں ہم اپنے دل میں رستم کے تئیں پچھاڑا

آتش غم نے ہم کو سرد کیا — دل پھپولا ہوا وہ درد کیا
بتوں کی بھی یہ یاد دوروز ہے — ہمیشہ رہے نام اللہ کا
اب جلائے ٹک آن کر ساقی — عمر کا بھر چکا ہے پیمانہ
عشق میں جائے گا کہیں مارا — بے طرح دل ہوا ہے آوارا

مقبول اس جہاں کا ہرگز غنی نہ دیکھا
راجا وہی ہے جو کوئی یہاں سے گیا ہے رانا

سجاد کوئی دیکھے بے تابیاں تو دل کی — ہے زندگی ہماری یہ موت کا نمونا
یار سے دل ملا وہ غیر ستی — نہ دل اپنا ہوا نہ یار اپنا
لاؤتے ہو میرے آگے کیا دوا — خون دل اپنا پیوں ہیں یا دوا
دل میں تو خطرہ نہ لا ہرگز طبیب — دیکھ کر میرے مرض کو لا دوا
جان و دل سب قبول ہے جانا — پر گلی میں تری مجھے آنا

ہیں نے جانا تھا قلمبند کرے گا وہ حرف — شوق کے لکھنے کا سجاد نے دفتر کھولا
بیٹھے اگر خوشی سے آکر چمن میں بلبل — کریال میں غلیلہ ایسا لگے کہ اڑ جا
خط کتروا کے آج قینچی سے — ہم سے ملنے میں جائے ہے وہ کتر

تیری شمشیر سے جدا ہو کر — سر مرا مجھ کو تن نہیں دیتا
کیا کرے پاؤں بھی کہ جنگل میں — کچھ نہیں آبلوں سے چل سکتا
مرے دیکھ کر حال داماں کا — پھٹے کیوں نہ سینہ گریباں کا

سب کی نظر سے گر کر ایک دم میں پست ہو جا
گر مے کشوں میں آوے زاہد تو مست ہو جا

قاتل کی تیغ آگے جاتے ہیں ہم ندھڑکے
ہرگز ہمارے دل میں سر کا نہیں ہے دھڑکا

شتابی پلا دے کہ جاتا ہے ابر — جو کچھ باقی ساقی رہی ہو شراب
سجاد مہرباں کرے کوئی اس کو کس طرح — غصہ ہوا ہے یار میں کچھ ان دنوں غضب
چین دے ہے نہ چین لے ہے آپ — دل ہوا ہے ہمارے جیو کچھ پاپ
کبھی منزل پہ ہوئی نہیں پوری — بہت اس راہ کو گئے ہیں ماپ

ہر کام کا اگرچہ ہوتا ہے سہل اوّل
پر عشق کی ستم ہے کوئی ابتدا نہایت

ایک دکھ ہے عاشقی کے پنتھ میں — پاؤں کے نزدیک راہ دور دست

جلنے سے صدق دل کے سبب بچ گیا خلیل
وہ بات ہے کہ سانچ کو ہرگز نہیں ہے آنچ

دل آبادی میں تنہا کھینچ مت رنج — کہ ویرانے میں دیوانوں کا ہے گنج
بنہیں مت رہ دیوانے عقل کے — کر گریباں چاک چھاتی کھول کر

غیروں کو جان خواب میں غفلت کے ڈال کر
اک رات آکے سو رہو ہم پاس آنکھ موندھ

مر گئے پر اگر نہیں آسیب — کیوں یہ رکھتے ہیں قبر پر تعویذ

مت ہو نالہ عبث کو جا کاغذ — اپنے اوپر نہ حرف لا کاغذ
یہ دھواں سا فلک ستاروں ساتھ — ہے نظر میں مری جلا کاغذ
آسماں ایک رقعہ وار نہیں — غم کے لکھنے کو ہو بڑا کاغذ
جیتے چمن کے بیچ بٹھائے ہیں نونہال — تعظیم تیری کرتے ہیں سب اٹھ کے یک قد

اس فصل گل میں جوش جنوں کا ہوا ہے قہر
جنگل میں آ بھرا ہے نکل کر تمام شہر

ہوتی نہیں ہے سرد ہمارے یہ دل کی آگ
لاگی ہے جس زمانے سے جلتی ہے دہر دہر

سبھی جلتے تھے شمع و پروانہ — رات یہ دن تھے اہل مجلس پر
باد صبا سے زلف معطر کی ہم تلک — مدت ہوئی کہ پہنچی نہیں کچھ خبر عطر

کوئی گم گیا ہوگا زلفوں کی راہ — بہت رکھتے ہیں اس سفر سے عذر

دیوانہ کا نہیں مطلب دیوانہ — تو کیوں نامہ ہے سطروں کی زنجیر
شوق جنوں میں تیرے عوض چاک جیب کے
نرگس چمن میں دیکھے ہے آنکھوں کو پھاڑ پھاڑ
لخت جگر ہمارا پانوں کے ساتھ کھاکر — کرتے ہو ہم سے باتیں اب تم چبا چبا کر
کیوں زرق برق کرکے نہ حاضر ہو تجھ حضور
ہیں تیرے گھر کے سب یہ زری پوش خواجہ تاش
کھا گیا مجروح دل میرے کو داغ — حال کیا کچھ گوشت کا کرتا ہے زاغ
میرے تمام حال کی تقدیر ہے یہ زلف — روز سیاہ و نالۂ شب گیر ہے یہ زلف
خاموش اس سبب سستی رہتا ہے بیشتر — تنگ اس قدر ہے منھ کو نکلتا نہیں ہے حرف
دُرّ میں رخسار کے تیرے کہیں انصاف نہیں
خط چھپائے جائے دل کو اور باندھی جائے زلف
جس خوبرو کے دل میں نہ عاشق سے ہو نفاق
کہتے ہیں سارے اس کے تئیں حسنِ اتفاق
دل کو کبھی پیار دلا کرکے تو سجن — لاگا نہیں گلے سے مرے آکے آج لگ
جب تک ترے بدن کو نہ عاشق بدن لگائے
لگتا نہیں ہے تب تئیں ہرگز کچھ اس کے انگ
زلفوں کے جب اُلجھتے ہیں اس ساتھ آکے بال
دیتا ہے شانہ عاجزی سے دانت تب نکال
گلی میں تری بیٹھتے ہی سجن — ان آنکھوں سے آتے ہیں آنسو نکل
تدبیر اور کچھ نہیں مجنوں کے حسبِ حال — لیلیٰ کے والدین اسے دیں شہر نکال
کیا جانتے تھے ہم سے مل کرکے اصل سے گل
اب کی بہار میں یوں ہو ویں گے فصل سے گل
سجاد فکر ہم نہ کریں کیوں کہ شعر کی — لگتے ہیں جاکے یار کے منھ سے سخن میں ہم

ایک دل رکھتا ہوں جو چاہے سو لے جاوے اسے
خواہ زلفیں، خواہ ابرو، خواہ مژگاں، خواہ چشم
پھر جا ہیں خوبرو آنکھیں کریں ہیں جب بناؤ
دے کے سُرمہ کے تئیں ہو جا ہیں ظالم سیاہ چشم
جب ہم آغوش یار ہوتے ہیں — سب مزے در کنار ہوتے ہیں
ناخدائی ٹک ایک کر ساقی — ایک کشتی میں پار ہوتے ہیں
تیر ڈوبیں کسی نشانے پر — میرے سینے کے پار ہوتے ہیں
اب تو ہم نے کیا گریباں چاک — تیرے دامن کو کس طرح چھوڑیں
برابر اپنے سجن بندگی کے کاموں میں — نہیں میں دیکھا صاحب کوئی غلاموں میں
کس طرح کوہ کن پہ گزریں گی — ہجر کی یہ پہاڑ سی راتیں
میں نے شاعر سے یہ شعر یوں سُن رکھا ہے:
ہجر شیریں میں کیونکہ کاٹے گا — کوہ کن یہ پہاڑ سی راتیں
ہیں شیشیاں شراب کی پیالے بھری ہوئیں
آنکھیں نشہ کے بیچ تمہاری گلابیاں
میں جو اس کی گلی میں جاتا ہوں — دل کو کچھ گم ہوا سا پاتا ہوں
سایہ ہیں ہم اس باغ کے ہر بلبل و گل ساتھ
مُدّت تئیں دیوار بہ دیوار رہے ہیں

دیکھوں طبیب درپئے دارو ہے کب تئیں
مرتا ہوں میں تو عشق میں جیتا ہوں جب تئیں
جو اک دبیج ہے ابروے خمدار میں — کہاں پائی یہ ضرب تلوار میں
ہر سادہ رو مخطط ہونے کی دھن رکھے ہے — لیکن کوئی نکالے تیرا سا خط تو لکھ دیں

جب کہے ہے ترے دہن کا بیاں — منہ سے غنچہ کے پھول جھڑتے ہیں
تیغ تیری کے تلے دھر جائے سر — جان اتنا کوئی جی رکھتا نہیں

تیری وحشی نگہ سے جنگل میں   بھاگنے پر غزال بیٹھے ہیں

دونوں طرف جو منھ پہ ہیں موجیں سی جاریاں
لہریں ہیں میرے شوق کی زلفیں تمہاریاں

صیت شعراب مرا ہوا ہے بلند   شاعروں کو کہو کر فکر کریں

لب شیریں پہ اس کے مرتا ہوں   زندگی اپنی تلخ کرتا ہوں
یہ سجاد کے دل کے جلنے کی قدر   نہیں بوجھتی شمع اس کو بجھاؤ

میرا جلا ہوا دل مژگاں کے کب ہے لائق
اس آبلہ پا کو کیوں تم کانٹوں میں اینچتے ہو

ہر چند محاورہ میں تصرف جائز نہیں ہے۔ محاورہ اس طرح سے ہے کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہو۔ لیکن جب شاعر کو سخن میں قدرت حاصل ہو تو معاف پاجاتا ہے۔

دیکھ مہندی لگی ان ہاتھوں کو   پھول آکر لگے ہیں پانوں کو

تو روزِ وصل میں لے بیٹھے پاس کن کن کو
یہ راتیں ہجر کی کاٹی تھیں ہم اسی دن کو

چھاتی ترقے ہے کھلنے وس کی گانٹھ   زر ہو غنچہ کی طرح جس کی گانٹھ
سانپ کی طرح کنڈلی مارے ہے   زلف تیری ہے کوئی بس کی گانٹھ

نہ جوں زلف تیرہ ہے ہر دل کی آہ
نصیبوں سے ملتے ہیں بخت سیاہ

تجھ آنکھوں تلے اندھیرا ہے   پتلیاں یہ نہیں ہیں ہیں سیاہ

دل جیسے خط کے سبزے میں کھلیاں ہو گئے
پڑتے ہیں ایسے جنگ میں بھی کھیت گاہ گاہ

شرمندہ ہو گئی ہے ترے منھ سے آرسی
اب پھر کے رو برو ترے ہرگز وہ آئینہ

یار کا جامہ ہمیں ہے گا عزیز   یوسف اپنا پیرہن تہ کر رکھے
رات اُس زلف کا وہ افسانہ   قصہ کوتہ بڑی کہانی ہے
آپنے ہے خدا سے پیری میں   بُت پرستی ہے اور جوانی ہے
یہ کوئی گرا سو آخر تحت الثریٰ کو پہنچا   ظالم کے گھر کی گلیاں کچھ کم نہیں کوے سے

بے تکلف ہو سبھوں سے وہ ملے ہے سجاد
دختر رز بھی عجب طرح کی مستانی ہے

اگر یہ شعر میرا ہوتا تو مصرع اولیٰ میں نے اس طرح کہا ہوتا:

بے تکلف ہو بیٹھ سر پر چڑھے ہے سجاد

ہاتھ ہی میں رہے ہے طفلوں کے   یہ تماشے کا دل کھلونا ہے
ٹک کبھی کان دھر کر تم سنو نے   پرانے دردمندوں کی ہے یہ نے
بختوں بازی کہیں سجن مل جائے   لیکن ایسے کہاں نصیب مرے
عشق کی ناؤ پار کیا ہووے   جو یہ کشتی ترے تو بس ڈوبے

حالانکہ تمام اشعار سبحان اللہ عمدہ ہیں لیکن فقیر کو اس شعر کو دیکھنے سے فوراً وجد آجاتا ہے۔ مجھ کو یہ شعر پڑھ کر بہت لطف حاصل ہوتا ہے چاہتا ہوں کہ اس شعر کو سو جگہ لکھوں۔

نہیں غیر سے صحبت اب آہنی   اے دوستی ہم سے ہے دشمنی
بتوں کے تئیں کس قدر مانتا ہے   یہ کافر مرا دل خدا جانتا ہے

جب تک نہیں پہنچتی ترے آستاں تلک
تب تک ہماری خاک کی مٹی خراب ہے

کچھ یہ سجاد کے جیو پر ہی عجب حالت ہے
ورنہ دیکھے ہیں میں اس درد کے بیمار کئی

(موچیں .... شیخ ..... نوچے سے کیا اوپڑتی ہے)

اے صنم زنار پہنی تجھ وفا کے واسطے   ورنہ کوئی کافر نہیں ہوتا خدا کے واسطے
عاشقوں کا صنم لہو پی پی   دم بدم تیری تیغ اوگلے ہے
ماہرو بن یہ شمع محفل میں   جیسی روشن ہے سب پہ روشن ہے

سپرداری اس کی کسی سے نہ ہو	یہ ابرو تری ننگی شمشیر ہے
پاؤں جنگل میں دھرنے دیتے نہیں	کیا پھپولوں نیں سر اُٹھایا ہے

ہرگز آنے نہ دیں گے غیروں کو
جان ہرچند ہم گئے، ہوں گے

حشمت

میر محتشم علی خاں، حشمتؔ تخلص۔ سید صحیح النسب تھا۔ اپنے زمانے کے اچھے لوگوں میں سے تھا۔ اچھا شاعر، فارسی اور ریختہ کے شعر کی سمجھ بوجھ رکھنے والا، سنجیدہ طبع، بہت رنگین شعر کہتا تھا۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ وجشتی بافیقی نے کہا یہ ترکیب بند اس کے اپنے حال کے مطابق ہے۔ سادہ مزاج اور طنطنہ والا مرد تھا۔ ہر ایک کے ساتھ عجز و انکسار کے ساتھ پیش آتا تھا ایک چیز تھا کہ ہر ایک دل میں اس کی جگہ خالی ہے (بے مثل تھا) دہلی شاہ جہاں آباد کی خاک پاک سے تھا، مغل پورہ میں رہتا تھا۔ اس کا بڑا بھائی میر ولایت علی خاں ان لوگوں میں سے ہے جو بجا طور پر وقت کا سرمایہ کہلاتے ہیں۔ ایک مدت سے (ولایت علی خاں) روزگار ترک کر کے خانہ نشین ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی شعر گوئی بھی کرتا ہے۔ فقیر پر شفقت و عنایت بہت کرتا ہے۔ خدا اس کو اپنی امان میں سلامتی حفاظت سے رکھے اور اس پر نگاہ کرم رکھے۔ اور وہ مرد (محتشم علی خاں) ناہنجار زمانہ کی نامردی کے ہاتھوں اپنے وقت سے پہلے ہی وفات پا گیا۔ خدا تعالیٰ اس کی بخشش فرمائے۔ اس کی طبع عالی کا نمونہ پیش کرنے کی خاطر دو تین شعر یہاں لکھ دیے ہیں۔ حشمتؔ کا کلام:

نکہت گل نے جگایا کسے زنداں کے بیچ
پھر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ

بہار آئی دوانے کی خبر لو	اگر زنجیر کرنا ہے تو کر لو

کرم اللہ درد

کرم اللہ خاں دردؔ۔ نواب عمدۃ الملک امیر خاں بہادر کی بہن کا بیٹا ہے۔ بہت خوش فکر، رنگین شعر کا کہنے والا اور شاعری کا عاشق ہے۔ اس کی شاعری دردمندی سے خالی نہیں ہے۔ خوب[1] کہتا ہے اور سمجھ بوجھ بھی اچھی رکھتا ہے۔ بندہ اُس کی خدمت میں گیا تھا اور ایک بار ملاقات کی ہے، اس کی طبع شور انگیز ہے۔ آدمی اچھا ہے۔ خدا اس کو زندہ سلامت رکھے۔ اس کے کلام سے ہے:

میرے سینہ میں ہر یک سانس ہو کر پھانس کسکے ہے
خلش دل کی نکل جاوے تو کیا آرام ہو جاوے

سامنے ہوتے ہی پھر نعش نہ پائی دل کی
بٹ گیا نوک سنا پر صفِ مژگاں کے بیچ

فغاں

اشرف علی خاں، فغاںؔ تخلص۔ بادشاہ احمد شاہ کا کوکا (یعنی انّازادہ) ہے۔ محمد شاہ (بادشاہ) کا بیٹا ہے اور چھوٹے امرا کے مصاحبین میں شمار ہوتا ہے۔ (بڑا دگبرو) جوان، قابلیت والا اور ہنگامہ برپا کرنے والا ہے۔ ریختہ کی شاعری اچھی طرح کر لیتا ہے اور کبھی کبھار فارسی میں بھی غزل موزوں کرتا ہے۔ قزلباش خاں مرحوم کا شاگرد رہے۔

ان دنوں اس کی طبیعت لطیفہ گوئی کی جانب بہت مائل ہے چنانچہ

[1] پیرس: سچ یہ ہے کہ خوب کہتا ہے، خوب سمجھتا ہے۔ طبع شور انگیز رکھتا ہے بندہ کو ایک بار ملاقات کا اتفاق ہوا اور بعد میں خوب روابط بڑھے۔ آدمی اچھا ہے خدا اس کو زندہ سلامت رکھے (مترجم)

ناگرمل جو بڑے ڈیل ڈول کا ہے اور مملکت کے معاملات میں دخیل ہے۔ (اس کو) گھی کی منڈی کا سانڈ کہا ہے جس نے اس (ناگرمل) کو دیکھا ہے اس کو (یعنی پھبتی کا مطلب) سمجھ گیا ہے۔ اور حکیم معصوم کو دربار معلیٰ میں گجراتی گائے کا نام دیا ہے۔ جو حکیم صاحب کو دیکھتا ہے، اس بات کو جانتا ہے۔ بندہ کی اس کے ساتھ گاڑھی چھنتی ہے۔ اس کے چند اشعار تحریر کیے جا رہے ہیں:

وہ چلے یا نہ چلے ہے فغاں آپ چاہیے
اپنے کیے کو ہاں میرے صاحب نبھائیے

ساقی نہ میں یہاں آپ سے کچھ چشم تر آیا
دل دیکھتے ہی ابر کو ناچار بھر آیا

آوارہ پریشاں و شکستہ دل و بدنام
سنتے تھے فغاں جس کو وہ آج ہی نظر آیا

شمع رو مت راہ وے خلوت میں پروانے کتیں
اے ترے قرباں ہم کیا کم ہیں جل جانے کتیں

سنا گیا ہے کہ ایک دن اشرف علی خاں فغاں اور نواب امیر خاں مرحوم، بادشاہ محمد شاہ نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں حاضر تھے۔ بادشاہ نے از راہ شفقت و مہربانی فغاں سے فرمایا کہ اگر ان دنوں تو نے ریختہ کے اشعار تازہ کہے ہیں تو پڑھ۔

فغاں مذکور نے جو شعر تازہ کہا تھا اقدس اعلیٰ کی خدمت میں عرض کر دیا۔ اس کی بہت تعریف ہوئی۔ نواب امیر خاں بولے کہ شعر بہت رنگین (ہے) اور مضمون (کافی) روشن (طریقہ سے) ادا کیا گیا ہے پھر بھی اگر لفظ "قرباں ہم" کی بجائے "بل جائیں ہم" ہوتا تو (شعر کا) رتبہ ہی اور ہو جاتا کیونکہ بات "بل جائیں ہم" میں پروانے کے جلنے کے لیے تمام مناسبات ہیں۔ حضرت ظلِ سبحانی نے تعریف فرمائی اور اپنی زبان مبارک سے "اے تیرے بل جائیں ہم" کو دوبارہ ادا کیا گویا قالبِ شعر میں جان چمک گئی۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشک سرخ کا
کب آستیں تیری مرے لوہو سے بھر گئی

اس شعر کو مرزا رفیع سودا نے اپنی غزل میں قطعہ کیا ہے اور کیا خوب کہا ہے۔

حاتم

شیخ محمد حاتم، حاتم تخلص۔ شاہ جہاں آباد کا رہنے والا ہے۔ کہتا ہے کہ میں میاں آبرو کے ساتھ بہت گھلا ملا تھا۔ آدمی جاہل، مغرور اور بنی ہوئی (مقطع) وضع کا ہے۔ کھرا اور خر دماغ ہے۔ یہ پتہ نہیں چلا کہ یہ شاعری کی وجہ سے بوڑھے بھیڑیئے کے جیسا بن گیا ہے۔ اپنے برابر کسی کو سمجھتا ہی نہیں یا اس کا یہ انداز پہلے سے ہی ہے۔ بہرحال خوب ہے۔ ہم کو ان سب باتوں سے کیا کام۔ شاعری اس کے پاس بہت ہے۔ اس کا دیوان میم کی ردیف تک میرے ہاتھ آیا ہے۔ یہاں اس کے فردیات لکھے جا رہے ہیں۔ میرے ساتھ بے تعلقانہ دوستی کا سلسلہ ہے۔ اس کے کلام سے:

مثالِ بحر موجیں مارتا ہے — لیا ہے جن نے اس جگ سے کنارا

آزاد کو بھلا ہے رہنا جہاں میں ننگا — بیگا لباسوں میں جن نے لباس رنگا

پانوں مت دھر بوالہوس بحر عمیق عشق میں
جان کو ڈوبا ہے یہاں انجان جو آکر ترا

نال کی سی طرح چاہے تھا کہ بالا دے مجھے
مدعی آخر کو اپنے زور میں آپ ہی گرا

آبِ حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا — مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا

ہجر میں زندگی سے مرگ بھلی — کہ کہے سب جہاں وصال ہوا

تو نہیں تو کنج تنہائی میں ہے — بوریا کا نقش ہم پہلو مرا

ہر قدم پر سرد پانی ہے بہے — جو چلے وہ قامت دلجو مرا

حاتم بیکس کا تجھ بن کون ہے — کون ہوگا جو نہ ہوگا تو مرا

ہائے بے درد سے ملا کیوں تھا آ گئے آیا مرے کیا میرا

اگر شعر میرا ہوتا تو میں نے اس طرح کہا ہوتا:

مبتلا آتشک میں ہوا ہے میں
آ گئے آیا میرے کیا میرا

اس مصرع کے سامنے کی گرمی اور اس شعر کی ٹھنڈک صاف ظاہر ہے۔

لیا اس گلبدن کا ہم نے بوسہ تو کیا جو ماں رقیبوں نے ہمارا

شاید عمل کیا ہے رقیبوں کی بات پر لب تر دیوں کا چور پھرے ہے چھپا ہوا

نظر آتا تھا بکری سا کیا پر ذبح شیروں کو
نہ جانا میں کہ یہ قصاب کا رکھتا ہے دل گُردا

ان دنوں میں دیکھ کر ہم کو ابھرتے ہیں رقیب
پیٹ ہے ان کا بھرا کل پرسوں مرتے ہیں رقیب

وصف آنکھوں کا لکھا ہم نے گل بادام پر
کرکے نرگس کو قلم اور چشم آہو کی دوات

مے پلا کر راہ کھویا ہے رقیبوں نیں اسے
آوے حاتم کی طرف جب کہ جھومت آوے

چھین لیتے ہیں مرے دل کو نگاہوں کے بیچ
حسن رہ زن ہے یہ پنجاب کی راہوں کے بیچ

ہات حاتم کا پکڑ پار اتار و یا شاہ
گرچہ ہے غرق سدا بحر گناہوں کے بیچ

تم بنا جان نہیں، جان مرے، جاں کے بیچ
تم مگر آ کے جلاؤ گے مجھے آن کے بیچ

ایک دن ہاتھ لگایا تھا ترے دامن کو
اب تلک سر ہے خجالت سے گریبان کے بیچ

ہوئی زباں لال ترے ہاتھ سے کھاتے بیڑا
کیا فسوں پڑھ (ھ) کے کھلایا تھا مجھے پان کے بیچ

آج حاتم سے سجن تم نے بُرا کیوں مانا
کیا خلل اون نے کیا آ کے تیری شان کے بیچ

عشق نے چٹکی بھری جب آ کے میری جاں کے بیچ
آگ سی .... بریاں کے بیچ

زلف و خال و چشم و خط چاروں ہیں دشمن دین کے
حق رکھے ایماں سلامت ایسے کفرستاں کے بیچ

اہل معنی جز، نہ بوجھے گا کوئی اس رمز کو
ہم نے پایا ہے خدا کو صورت انساں کے بیچ

گر عدو میری بدی کرتا ہے خاص و عام میں
میں اسے رسوا کروں گا باندھ کے دیواں کے بیچ

شعر[1] اچھا ہے لیکن بات تبدیل کر کے لی ہوئی ہے (سرقہ ہے) اس نے دیوان میں بادشاہ کو لانا کہا تھا اور بادشاہ کے رو برو کہا تھا۔ اس شاعر کا نام ذہن سے نکل گیا ہے۔ دیوان میں آقا کا ہونا روا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ آقا بھی خود عزت مآب (اپنے آپ) کو میرے دیوان میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

کوئی دیتا نہیں ہے داد بیداد کوئی سنتا نہیں فریاد فریاد

سجن نے یاد کرنا مہ لکھا اور ہم رہے غافل
بجا ہے معذرت لکھنا ہمیں کاغذ خطائی پر

آج نرگس کا قلم کر کے سجن لکھتا ہوں وصف آنکھوں کا ترے کاغذ بادامی پر

جب سوں تری نظر پڑی ہے جھلک
تب سوں لگتی نہیں پلک سے پلک

[1] یہ عبارت نسخۂ پیرس میں نہیں ہے۔

دیکھ طور اس دور کا حاتم نیں کی ترک شراب
یاد کر کے سبز رویاں کو وہ اب پیتا ہے بھنگ

سبز رویاں کے لفظ میں ہر صاحب سخن کو تامل کرنا ضروری ہے کیونکہ اس لفظ سے اس ہیچمداں کے کان آشنا نہیں ہیں۔

ایہام

خلصے سجن کا ملنا تن سکھ ہے عاشقوں کو　　گاڑھے رقیب سارے مرتے ہیں ہات ململ

دلوں کی راہ خطرناک ہو گئی آیا　　کہ چند روز سے موقوف ہے پیام و سلام

مارا ہے سنگ دل نے دکھا مجکو رنگِ سرخ
تعویذ بجھ مزار کا لازم ہے سنگِ سرخ

یکرو

یکرو تخلص۔ یہ شخص میاں آبرو کا شاگرد تھا، اس سے زیادہ اس کے حالات سے میں واقف نہیں ہوں۔ مگر دو تین دفعہ اس کو ریختہ خوانی کی مجلسوں میں دیکھا ہے۔ حالانکہ ریختہ کے فن میں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی مگر اپنے آپ کو ہمہ داں شمار کرتا تھا۔ اس کے کلام سے ہے:

دل پر مرے ہیں داغ ترے ہجر کے کئی
گننے میں جن کے عمر مری سب گزر گئی

پاکباز

میاں صلاح الدین عرف مکھن، پاکباز تخلص۔ گوشہ نشین شخص ہے۔ میاں یکرنگ کا شاگرد ہے کہ جن کا احوال لکھا جا چکا ہے۔ ملنا جلنا بہت کم ہے گویا دوست ہونا جانتا ہی نہیں ہے۔ میاں شاہ کمال کا فرزند

ہے، شاہ جلال قدس سرہٗ کا پوتا ہے۔

اکثر و بیشتر درود اور وظیفوں میں مشغول رہتا ہے۔ فقیر کے مکان پر جو ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو ریختہ کے شعرا کا جلسہ ہونا مقرر ہو گیا ہے اس میں اگر یاد رہے تو ضرور آتا ہے۔ اس کا مزاج جنون سے خالی نہیں ہے۔ یہ شعر اس کے ہیں:

جلوے تمہارے حسن کے نت ہیں، پہ ہم کہاں
تم تو سجن ہمیشہ ہو، افسوس ہم نہیں

مجھے درد و الم رہتا ہے نت گھیرے میاں صاحب
خبر لیتے نہیں کیسے ہو تم میرے میاں صاحب

بے تاب

محمد اسمٰعیل، بے تاب۔ آدمی درویش تھا۔ مصطفےٰ خاں یکرنگ کا شاگرد، بے حد مستقل مزاج اور عمدہ حالات زندگی والا۔ ابھی کی بات ہے جعفر علی خاں کے مکان کی طرف جا رہا تھا، گھوڑے کی پیٹھ سے گر گیا اور ہاتھ ٹوٹ گیا۔ دو تین مہینے کی بیماری اٹھائی اور ہر چیز سے آزاد ہو گیا۔ خدا اس کی مغفرت فرمائے۔ فقیر کے ساتھ بھی دوستی تھی۔ یہ شعر اس کے ہیں:

نہ ہوتا گر کسی سے آشنا دل　　تو کیا آرام سے رہتا مرا دل

تڑپ کر مر گئی بلبل قفس میں
پڑی تھی ہائے کس ظالم کے بس میں

یقین

انعام اللہ خاں، یقین تخلص۔ ریختہ کا شاعر، صاحبِ دیوان ہے۔ شہرت بہت رکھتا ہے اس لیے تعریف و توصیف کی ضرورت نہیں ہے۔ مرزا مظہر

جان جاں سے تربیت پایا ہوا ہے۔

اس کے والد کا نام اظہر الدین خاں تھا، اس کے دادا سے بھی میں سرہند کے مقام پر ملاقات کر چکا ہوں۔ بڑا انسان آدمی تھا، ملاقات میں بہت لطف آیا تھا اور فقیر کے ساتھ وہ نہایت اچھی طرح اور تواضع سے پیش آیا تھا۔ فقیر کی کھانے کی دعوت کی۔ بہت دیر تک اس مرحوم کے ساتھ میں بیٹھا اور صحبت کا لطف اُٹھایا۔ فارسی میں نیک و مہربان شخص کی طرز پر شعر کہتا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ میاں یقینؔ کے بارے میں لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ مرزا مظہرؔ اس کو شعر کہہ کر دیتے تھے اور وہ اپنے آپ کو ان کے ریختہ کے اشعار کا وارث شمار کرتا ہے۔ اس بات کو تسلیم کرنے میں بندہ کو بڑی ہنسی آتی ہے کیوں کہ آدمی کو وراثت میں شاعری کے علاوہ باقی سب چیزیں ملتی ہیں۔ مثلاً کوئی شخص اگر اپنے باپ کی شاعری یا اس کے مضمون کو استعمال میں لائے تو سب لوگ اس کو چور کہیں گے، پھر اُستاد کی شاعری کو اپنا کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔

قصہ مختصر کچھ حقیر و پوچ اشخاص اپنے بنالیے ہیں۔ مَیں اور آپ بھی اگر چاہیں تو ایسے لوگوں کو اپنا (ہم خیال) بنا سکتے ہیں۔ اس قدر خود پسند ہے کہ فرعون کی رعونت بھی اس کے سامنے بیچارگی کا اظہار کرے۔ اور اس شخص سے ملاقات کرنے پر اس قدر اپنے آپ معلوم ہو جاتا ہے کہ شعر فہمی کی تمیز اس کو چھو کر نہیں گزری۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے بارے میں لوگوں کا گمان یہ ہے کہ یہ شخص موزوں طبع ہی نہیں ہے۔ اور اس بات پر اتفاق رائے ہے کہ اس کی شاعری نقائص سے خالی نہیں ہے کیونکہ شاعر اس قسم کا کم فہم نہیں ہوا کرتا۔

ایک صاحب کا کہنا ہے کہ نواب عنایت اللہ خاں مرحوم کے فرزند نواب عطیہ اللہ خاں کے مکان پر انعام اللہ خاں یقینؔ بیٹھا تھا اور یہ کہہ رہا تھا: "جس دن سے مرزا (مظہرؔ) نے استادی کا ہاتھ میرے[1] سر پر[2] رکھا ہے میری شاعری

ترقی کر گئی ہے۔ ان صاحب نظامی کا یہ مصرع حاضرین مجلس کے سامنے بلند آواز سے پڑھ دیا:

شد آں مرغ کو خایہ زریں نہاد

(وہ پرند سونے کا انڈہ دینے والا تھا)

نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا انڈہ پگڑی میں ٹوٹ گیا (یعنی چور رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔)

میاں شہاب الدین المتخلص بہ ثاقبؔ جن کے حالات آگے لکھے جائیں گے، انھوں نے بیان کیا ہے کہ مَیں صرف آزمانے کے لیے اس کے مکان پر گیا اور ایک غزل کی طرح مقرر کی۔ میں نے باقاعدہ پوری غزل کہہ ڈالی اور اس سے ایک مصرع بھی موزوں نہ ہوا۔ باقی خدا بہتر جانتا ہے۔

میاں محمد حسین کلیمؔ جس کے حالات بیان کیے جا چکے ہیں، اس نے ایک قصیدہ روضۃ الشعرا کے عنوان سے کہا ہے۔ اس کے اندر تمام شاعروں کے نام بیان کیے ہیں۔ ان تمام ناموں میں اس کا نام لایا ہے لیکن ایک عجیب و غریب اشارے کے ساتھ، جس کو سخن فہم سمجھ جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

یقینؔ کے شعروں پہ ہیں بدگماں بعضے کہ اس کے تئیں

غلط ہے ہم نے بوجھا ہیگا مرزا جان جاناں کو

نام مرزا جان جاں ہے اور شاعر نے جان جاناں باندھا ہے کیونکہ اکثر عام لوگ مرزا کا نام غلطی سے جانِ جاناں کہتے ہیں۔ شاعر مذکور نے بھی اسی شہرت کو مدنظر رکھ کر وہی موزوں کر دیا حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا کیوں کہ ہماری گفتگو خواص کے ساتھ ہے۔

بہر حال اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ میاں یقینؔ ایک (لائق احترام) بزرگ کی اولاد ہے، اس کی شرافت اور اعلیٰ نسبی میں بھی چوں چرا کی گنجائش

پچھلے صفحہ کا حاشیہ:۔

[1] پیرس: میرے سر سے اٹھا لیا ہے۔ میری شاعری ترقی نہیں کر رہی ہے۔

[2] شورش: میرے سر سے اٹھا لیا ہے، میری شاعری ترقی کر گئی ہے۔

نہیں ہے، بڑے خاندان سے ہے، بندہ کے ساتھ بھی سرسری دوستی ہے۔ یہ
شعر اس کے ہیں:

دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس
کوچہ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

رو اگر دیجیے اس کو بھی تو کچھ عیب نہیں   آئینہ سے بھی گیا گیا دل حیراں میرا

یقین اس کے دُر دنداں کی باتیں جو کیا چاہے
صدف کی طرح دھوئے آب گوہر سے دہن اپنا

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامہ کے بند
برگ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

حالانکہ ریختہ کے اکثر شاعروں کے یہاں تبدیل کیے ہوئے اشعار مل جاتے ہیں۔ ان کو تبدیل کیا ہوا شعر کہتے ہیں اور توارد کا نام دیتے ہیں گویا کسی استاد نے یہ شعر ان لوگوں کے واسطے ہی کہا ہے:

ہر چہ گویند بے محل گویند
در توارد غزل غزل گویند

(ترجمہ: درست کہ انھوں نے کہا ہے مگر بے موقع کہا ہے۔ انھوں نے ہر ایک غزل توارد میں ہی کہی ہے۔)

لیکن یقین کا شعر لفظاً لفظاً رائے آنند رام مخلص کے شعر کی تبدیل کی ہوئی نقل ہے۔ مخلص کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ زیادہ تماشا یہ ہے کہ اس میں سرقہ کا سلیقہ پورا تھا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ مضمون اصل میں کس نے نکالا تھا۔ شعر یہ ہے:

[1] پیرس: پرانے شاعروں نے اس مضمون کو فارسی میں باندھا ہے اس لیے لکھ رہا ہوں لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ شعر کس کا ہے۔ فارسی:
ناخن تمام گشت معطر چو برگ گل   بند قبائے کیست کہ وا می کنیم ما

ناخن تمام گشت معطر چو برگ گل
بند قبائے کیست کہ وا می کنیم ما

(ترجمہ: تمام ناخن برگ گل کی مانند معطر ہو گیا۔ کس کی قبا کے بند تھے جو میں نے کھول ڈالے۔)

یہ اشعار یقین کے ہیں:

آنکھ سے نکلے پر آنسو کا خدا حافظ یقین   گھر سے جو باہر گیا لڑکا سو ابتر ہو گیا

یقین سوز و گداز اپنے کو گر اظہار میں کرتا   خدا شاہد ہے آتش کا بھی زہرہ آب ہو جاتا
اگر مکر نہ میں اس شوخ کی خاطر نشاں کرتا   خدا جانے وفا میری کے حق میں کیا گماں کرتا
زباں فولاد کی ہو جب جواب کوہکن دیجے   ستم ہوتا اگر پرویز کو عشق امتحاں کرتا

کہتے ہیں کہ تسخیریں آئینہ کو آتی ہیں
دل سے نہ ہوا جو کام آئینہ سے کیا ہوگا

نہ دیتا عیش کی خسرو کو فرصت قصر شیریں میں
جو میں ہوتا تو جائے شیر جوئے خوں رواں کرتا

ناچاری سے دل اپنا گیا گو رہیں یقین   اس جنس کا جہاں میں کوئی قدرداں نہ تھا

عاشق اور معشوق عالم کے سند کرتے ہیں سب
تجھ سے خونخواری کی طرز اور مجھ سے غم کھانے کی طرح

اب جو اُڑ بیٹھیں قفس کے بام پر مقدور نہیں
حیف ہم آگے نہ بوجھے اپنے بال و پر کی قدر

کیا کروں مژگان تر کے ابر نے ڈالا ہے شور
آج بادل بے طرح امنڈے ہیں یہ برسیں گے زور

خال گورے مکھ کا لیتا ہے مرے دل کو چرا
اس نگر میں چاندنی راتوں کو بھی پڑتے ہیں چور

دل نہیں کھنچتا ہے بن مجنوں بیاباں کیطرف
خوش نہیں آتا نظر کرنا غزالاں کی طرف
اس ہوا میں رحم کر ساقی کہ بے جام شراب
دیکھ کر چھاتی بھری آتی ہے باراں کی طرف

ہمارے درد کی دارو اگر کچھ ہے تو دارو ہے
یہ سب کچھ سن کے ساقی بات پی جانے کا کیا حاصل

جب دیکھتا ہوں تنہا تجھ کو سجن چمن میں
کس کس طرح کی باتیں آتی ہیں میرے من میں
مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ مجھ کو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دِوانہ پن میں

اگر 'خوش نصیبی' کی بجائے یہاں 'خوش معاشی' کہا ہوتا تو یہ شعر بہت پر لطف ہو جاتا۔

خوباں یقیںؔ کو معذور اب تو رکھو کہ اس کے
لو ہو نہیں جگر میں آنسو نہیں نین میں

دوبارہ زندگی کرنا مصیبت اس کو کہتے ہیں
پھر اٹھنا بے دماغوں کا قیامت اس کو کہتے ہیں

نہ گزرا ہوگا مجھ سا کوئی رنگیں باؤلے پن میں
گریباں آپڑا ہے پھٹ کے گل کی طرح دامن میں

یقیںؔ سے جلتے بلتے کی خبر کیا پوچھ کر لوگے
پڑا ہوگا دیوانہ سوختہ سا کنج گلخن میں

کرتا ہے کوئی یارو اس وقت میں تدبیریں
مرتا ہے یہ دیوانہ اب کھول دو زنجیریں

وہ ناخن ابروخوباں سے خوشنما تر ہے — کسو کے کام کی جس سے کوئی گرہ وا ہو

خواب میں کس طرح دیکھوں تجھ کو بے خوابی کے ساتھ
جمع آسائش کہاں ہوتی ہے بے تابی کے ساتھ

مفت نہیں لیتے وفا کو شہر خوباں میں یقیںؔ
کس قدر بے قدر ہے یہ جنس نایابی کے ساتھ

زنجیر میں زلفوں کے پھنس جانے کو کیا کہیے
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے — نرا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے
اس اشک و آہ سے سودا بگڑ نہ جائے کہیں — یہ دل کچھ آب رسیدہ ہے کچھ جلا بھی ہے
یہ کون ڈھب ہے سجن خاک میں ملانے کا — کسی کا دل کبھی پاؤں تلے ملا بھی ہے

ایک پل بھی نہیں ٹھہرتا ہائے آنسو کی طرح — اس دلِ بے تاب کو کوئی تسلی کیا کرے
وصل کی گرمی سے مجھ کو ضعف آتا ہے یقیںؔ — دیکھیے مجھ ساتھ خوبوں کی جدائی کیا کرے

اس بسنتی پوش سے آغوش رنگیں کیجیے
جیو میں ہے اس مصرعِ موزوں کو تضمیں کیجیے

مزے سے عشق کے دوزخ بھی اس فرقے کے جنت ہے
خدا ہم کو کرے محشور اُمت میں محبت کے

نہ نکلا کام کچھ اس صبر سے اب نالہ کرتا ہوں
مری فریاد رسی شاید مری فریاد کو پہنچے

دیوانہ ہوں میں اپنے جیو سے مجنوں سلیقہ کا
مزے لے لے کے مرنے کی طرح فرہاد کیا جانے

یار اگر منظور ہے دنیا و عقبیٰ سے گزر
منزل مقصود ہے دونوں جہانوں کے پرے

مجھے یہ بات خوش آئے ہے اک مجنونِ عریاں سے
کیا کیجیے کہاں تک چاک ہم گزرے بیاباں سے

اسی مضمون کے قریب کا ایک شعر فقیر کا بھی ہے اور فقیر کی اپنی رائے کے

ل پیرس: فقیر نے بھی ایک شعر کہا ہوا ہے اسی مضمون کے قریب کا، اور فقیر اپنی رائے کے مطابق مرتبہ میں اپنے شعر کو بہتر جانتا ہے۔

مطابق مرتبہ میں وہ اس شعر سے بہتر ہے۔ شعر یہ ہے :

چاک پر چاک ہوا جوں جوں سلایا ہم نے
اب گریبان ہی سے ہاتھ اٹھایا ہم نے

یہ اشعار یقین کے ہیں :

نہ دے برباد خارِ آشیاں کو عندلیباں کے
صبا تو بھی ہوا خواہوں میں ہے آخر گلستاں کے

ٹک اک انصاف کر، کرتا ہے اتنی بھی جفا کوئی
کرے گا بعد میرے کس توقع پر وفا کوئی

ثاقب

میاں شہاب الدین، ثاقب تخلص۔ درویش آدمی ہے، توکل کرنے والا۔ میاں آبرو کا شاگرد۔ ابھی اپنی شاعری خاں صاحب سراج الدین علی خاں کے پاس لاتا تھا۔ کچھ مدت سے اپنے وطن گیا ہوا ہے، اس کا وطن (سادات) بارہ کے مضافات میں ہے۔ فقیر کے ساتھ بہت دوستی ہے۔ الغرض بڑے نمونے کی چیز ہے، ہر کام میں ہاتھ چلاتا ہے اور جانتا بوجھتا کچھ بھی نہیں۔ لب لباب یہ کہ آدمی خوب (مزے کا) ہے۔ خدا اسے زندہ سلامت رکھے۔ یہ شعر اس کا ہے :

ثاقب کی نعش اوپر قاتل نیں آکے پوچھا
یہ کون مر گیا ہے کس کا ہے یہ جنازا

یہ[1] بات واضح رہے کہ ملک دکن کی طرف کے اکثر شعرا کچھ رتبہ یا حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ مگر ان میں سے بعضے جیسے ولی محمد صاحب دیوان مشہور و معروف ہے اور سید عبدالولی عزلت اور سراج اور آزاد جو ولی کا ہم عصر تھا اور عارف علی خاں عاجز (وہ شعرا ہیں) کہ جن کے ہاتھوں میں مربوط ..... شعر گوئی کا سرا آگیا ہے اور ان کے علاوہ باقی تمام ٹھیک سے بات کرنا بھی نہیں جانتے۔ شعر گوئی سے ان کا کیا علاقہ۔ اس واسطے اکثر کے محض اشعار پر ہی اکتفا کیا گیا ہے اور لکھ دیے جا رہے ہیں۔

---

[1] نسخۂ انجمن میں یہ پوری عبارت مبہم ہے اس لیے اس سے صرف نظر کرنا ہی بہتر سمجھا گیا۔

ولی

ولی محمد، المتخلص بہ ولی۔ ملک الشعراء ریختہ کا زبردست شاعر، دیوان کا مالک، اورنگ آباد دکن کی خاک سے ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہ جہاں آباد دہلی میں بھی ایک مرتبہ آیا تھا۔ میاں شاہ گلشن صاحب کی خدمت میں گیا اور اپنے اشعار جستہ جستہ پڑھ کر سنائے۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ فارسی کے جو تمام مضامین بیکار پڑے ہوئے ہیں اپنے ریختوں میں کام میں لاؤ ورنہ (روز محشر) تم سے پوچھا جائے گا اور تمہاری پکڑ ہوگی۔ اس کے کلام کی بہت کچھ تعریف و تحسین بھی شاہ صاحب نے فرمائی۔ اس کی شہرت اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ یہاں اس کی تعریف کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے حالات زندگی جیسا کہ چاہئیں مجھے معلوم نہیں۔ یہ شعر اس کے ہیں:

نہ پوچھو عشق میں جوش و خروش دل کی ماہیت کو
برنگ ابر دریا بار ہے رومال عاشق کا

اس کے قدم کی خاک ہیں صد حشر ہے نجات
عشاق کے کفن میں رکھو اس عبیر کو

غرور حسن نے تجھ کو کیا ہے اس قدر سرکش
کہ خاطر میں نہ لاوے تو اگر تجھ گھر ولی آوے

خبرداری سے اس معشوق کے کوچہ میں جاوے دل
کہ اطراف حرم میں ہے ہمیشہ ڈر حرامی کا

اے غنچہ نہ کر تو فخر یہ دل — تکمہ ہے سجن کی بکتری کا

اے چھوڑ کے یار کیونکے جاوے — زخمی ہے شکار کیونکے جاوے
(جب لگ نہ ملے شراب دیدار — انکھیاں کا خمار کیونکے جاوے)
دیکھ کر تجھ نگاہ کی شوخی — ہوش عاشق رم غزال ہوا

اور مجھ پاس کیا ہے دینے کو — دیکھ کر تجھ کو روہی دیتا ہوں

کیا غم ہے اس کو گرمیٔ خورشید حشر سے
بخت سیاہ جس کے سر اوپر ہے سایہ باں

مت راہ دے رقیب سیہ رو کو ایکبار — ڈریے ہزار بار بلائے مہیب سے

دشمن دیں کا دین دشمن ہے — راہ زن کا چراغ رہزن ہے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو
کرتی ہے نگہ جس قد نازک پہ گرانی

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانہ ساقی
کہ دل سے تاب، جی سے صبر، سر سے ہوش لے جاوے

عالم میں ترے ہوش کی تعریف میں کی ہے
ایسا تو نہ کر کام کہ مجھ پر سخن آوے

سن ولی رہنے کو دنیا میں مقام عاشق
کوچۂ زلف ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

جلد چل ٹک عشق کی راہ میں کہ تا پہنچے کہیں
کاہلی کو رہ نہ دے سالک کو منزل دور ہے

پہنچتا ہے یہ دل کو ہر جا کہ — غم ترا روزیٔ مقدر ہے

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں دلبر سے
سوال آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

کیونکر سیری ہو حسن سے تیرے — دھوپ کھانے سے پیٹ بھرتا نہیں
اے جان ولی وعدۂ دیدار کو اپنے — ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے تو
یک دل نہیں آرزو سے خالی — بر جا ہے محال اگر خلا ہے

گناہوں کے سیہ نامے سے کیا غم اس پریشاں کو
جسے وہ زلف دست آویز ہو روز قیامت میں

عزلت

سید عبدالولی سلمہ اللہ، عزلت تخلص۔ بندرگاہ سورت کے رہنے والے ہیں۔ حضرت سید سعد اللہ قدس سرہٗ سورتی کے صاحب زادے ہیں کہ جو بادشاہ عالم گیر کے مُرشد تھے۔ یہ درویش مزاج، عالم فاضل، لائق احترام اور توکل کرنے والے ہیں۔

فارسی[1] میں بھی شعر کہتے ہیں۔ فارسی میں دیوان کے مالک ہیں۔ لب لباب یہ ہے کہ خوبیوں اور کمالات کا مجموعہ ہیں لیکن ان کی طبیعت کا جھکاؤ ریختہ کی جانب بہت ہے۔ حال[2] ہی میں ہندستان، کہ جہاں شاہ جہاں آباد واقع ہے، تشریف لائے ہیں۔ شاعری سے سب طرح تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے کلام کی طرزوں سے یہ شان ظاہر ہوتی ہے کہ دردمندی ان کے یہاں بہت ہے اس تمام ہنرمندی کے ساتھ ان کے اندر وسیع المشربی اس قدر جمع ہوگئی ہے کہ ہر رنگ میں پانی کے مانند گھُل مل جاتے ہیں۔ فقیر کے ساتھ بہت محبت کرتے ہیں اور بے اختیارانہ اس کو بروئے کار لاتے ہیں۔ آدمی صبر و تحمل والے ہیں۔ خدا ان کو زندہ سلامت رکھے۔ یہ شعر ان کے ہیں:

فقیروں سے نہ ہو بیرنگ لا لا فصل ہولی میں
ترا جامہ گلابی ہے تو میرا خرقہ بھگوا ہے

جس خوش نگہ کو پہنچوں غفلت کی نیند لیوے
میں خفتہ بخت شب کا افسانہ ہو رہا ہوں

اس کو پہنچی خبر کہ جیتا ہوں
کسی دشمن سیتی سنا ہوگا

عزلت گمان یوں تھا کہ جل کر ہوا ہے راکھ
پھر دود آہ دل نیں مرا دیدہ تر کیا

---

[1] پیرس: فارسی میں بہت عمدہ اور معیاری شاعری کرتے ہیں۔
[2] پیرس: کچھ مدت سے ہندستان آئے ہوئے ہیں۔

بندے ہیں تیری چھب کے مرے جمال والے
سب گل سے گال والے سنبل سے بال والے

اے بلبل اتنی رُو کے دعا ہر سحر نہ مانگ
حق تیری آہ سرد چمن کی صبا کرے

نہ پوچھو یہ بگولا ہے مرا ہم قول صحرا میں
یہ قبر حضرت مجنوں ہے ڈانواں ڈول صحرا میں

ہوئے لیلیٰ کے سر چڑھ اشک مجنوں نیل کے ٹپکے
یے موتی خاک بھی لیتا نہیں کوئی مول صحرا میں

بیاباں کے گلوں سے بوئے رنگ درد آتی ہے
اری بلبل چمن سیں دل اٹھا آ بول صحرا میں

نخل امید بے وفاؤں سے
دل سلامت پھرے تو پھل پایا

صحیح[1] اپنا مرض الفت کا جب میں عرض کرتا ہوں
جلے دل کی تشفی کو مجھے آنکھیں دکھاتا ہے

کیا گرم ہو دیتا ہے جواب خنک اے یار
تاب اپنے دم سرد کی نہیں دل کو ہمارے

چین ابروئے سجن میں میرا جیو الجھا ہے
دل کھلے گر کبھی دونوں میں گرہ پڑ جاوے

دل میں رندوں کے پھپھولا ہوا عمامۂ شیخ
یارب اس بزم سے یہ زہر کا مکڑ جائے

سدھارے گل کہاں سونے پڑے ہیں گلستاں اپنے
گئی ہیں بلبلیں کیدھر جلا کر آشیاں اپنے

نہ پوچھو یہ کہ کیفی چشم یہ سرمہ نے گھیری ہے
گریباں گیر ظالم بے سخن فریاد میری ہے

تجھ قبا پر گلاب کا بوٹا
دل بلبل گویا ابھی ٹوٹا

بجز رفاقت تنہائی آسرا نہ رہا
سوائے بے کسی اب اور آشنا نہ رہا

---

[1] پیرس: صریح

آزاد

آزاد تخلص، ولی کا ہمعصر تھا۔ بہت بچوں کی طرح بات کرتا تھا۔ یہ شعر اس کا ہے:

آئیں جہاں کی ساری آزاد صفتیں پر
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

سراج

میاں شاہ سراج، سنہ ے اورنگ آباد میں رہتا ہے۔ سید حمزہ کا شاگرد ہے۔ اتنا ہی سید صاحب مذکور (عبدالولی) کی بیاض سے استفادہ ہو پایا ہے۔ اس کی شاعری لطف سے خالی نہیں ہے۔ اس کے کلام سے:

تم پر فدا ہیں سارے حسن و جمال والے
کیا خط و خال والے، کیا صاف گال والے
مجھ زرد رنگ اوپر غصّہ سے لال مت ہو
اے سبز شال والے اودھی رومال والے

پی بن مجھ آنسوؤں کے شراروں کی کیا کمی
جس رات چاند نہیں ستاروں کی کیا کمی

نہیں ہے تاب مجھے سامنے ترے جاناں
کہاں سراج کہاں آفتاب عالمتاب

رفوگر کو کہاں طاقت کہ زخم عشق کو ٹانکے
اگر دیکھے مرا سینہ رفو چکر میں آجاوے

ہے تجھ آنکھوں کے گرفتاروں میں دل — کیوں نہ ہو مشہور بیماروں میں دل
شعلہ خو جب سے نظر آتا نہیں — لوٹتا ہے تب سے انگاروں میں دل

مجھ پریشاں کی طرف پھر کیونکے آئے
ہے ترے گیسو کے مہکاروں میں دل

عجب وہ سرو گلزار ادا خوش قد ہوا واقع — پر بلبل نہال گل کو دست رد ہوا واقع

ہائے رہ گئی دل میں دامنگیریوں کی آرزو
سبزۂ تربت مرا ہے پنجۂ گمشیر ہنوز

نہیں حقیقت میں حسن و عشق جدا — طوق قمری ہے طرۂ شمشاد

مدت سے گم ہوا دل بیگانہ اے سراج
شاید کہ جا پڑا ہے کسی آشنا کے ہات

شکر للہ ان دنوں تیرا کرم ہونے لگا — شیوۂ جور و ستم فی الجملکم ہونے لگا

نہیں ہوا اس شمع رو کے عشق میں داغ ایک سراج
ہیں وہ حسن آتشیں کے ایسے پروانے کئی

تجھ بھواں کے زخم کی لایا ہے تاب — خوب جا بہلا ہے تلواروں میں دل
ہے قیامت چشم و ابرو خط و خال — قید کیوں کرتے ہو لاچاروں میں دل

گل بدن شاید نظر آوے سراج
رات دن پھرتا ہے بازاروں میں دل

نہ بوجھو آسماں پر تم ستارے — ہماری آہ کی چنگاریاں ہیں
نہ جانوں آج کی شب کیوں کٹے گی — میری آنکھوں میں پلکیں آریاں ہیں

کبت۔ بحر سراج

مخمور چشموں کی تبرید، کرنے کو شبنم ہے سرد آبشوروں کی مانند
روپے کی تھالی سفیدی ہے نرگس کی زردی ہے زر کے کٹوروں کی مانند
دل کے خزانے سیں شاید لے جاوے گا جی کے جواہر کو عیاریوں سیں
ہر دم خیال اوس کا آتا ہے آنکھوں کے روزن سیں چھپ چھپ کے چوروں کی مانند

عاجز

عارف علی خاں، عاجز تخلص۔ دس بارہ سال پہلے کی بات ہے کہ یہ شاہ جہاں آباد میں تشریف لائے تھے۔ بندہ نے ان کا شور سنا تھا لیکن ان کی خدمت میں نہ پہنچ پایا۔ کچھ عرصہ پہلے دکن کی جانب چلے گئے ہیں۔ ابھی[1] سید مذکور کی زبان سے سنا ہے کہ برہان پور میں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے حسب نسب کے بارے میں مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔ ان کی زبان اوباشوں کی زبان ہے۔ شاعری اچھی کرتے ہیں، اکثر کبت کی بحر میں ریختہ کہتے ہیں۔ چند ایک اشعار اس کے کلام سے لکھے جا رہے ہیں۔ اکثر نامربوط (یا مشکل) قافیوں کو بہت خوبی کے ساتھ موزوں کر دیتے ہیں۔ یہ اشعار ان کے ہیں:

ہماری آہ کو لستا نہ سمجھو یہ بل بند
وہ گرز ہے کہ جو توڑے فلک کے ساتوں کھنڈ
تمہارے قد کے مقابل ہے سرو یوں بے ڈول
نہال سرو کے آگے ہے جوں درخت ارنڈ
ترے کلام سے دل کیوں نہ کانپے اے ناصح
کہ تیری تخ سے نصیحت ہے زمہریر سے ٹھنڈ

ترے رنگ تبسم سے بتوں کو دانت گھلنی ہے
ترے عارض کے تل سے گل رخوں کو تاب ملتی ہے
ہماری آہ کے نیزے سے اے ظالم حذر کریو
کہ افلاک اس کی زہر آلودانی کے آگے چھلنی ہے
کہاں سے قافیہ لا لا کے اپنے شعر میں ڈالا
ہیں عاجز دل میں تیرے داغ یا توں شیخ چلی ہے
میرے سینے میں جب سے داغ ہجر ماہ سیما ہے
خراش زخم ناخن سے ہلال کنج ایما ہے

---

۱ پیرس: ابھی سید عبدالولی صاحب کی زبانی سنا ہے کہ اورنگ آباد میں ہیں۔

اشارے جب سے دیکھے ہم نے اوس کے تیغ ابرو کے
ہمارا دل تو تب سے لخت لخت اور قیمہ قیمہ ہے
خیال اوس اچپلی کا کیونکہ پاوے دل میں ہم عاجز
کہ جس کے ناز کے توسن کے آگے برق دھیما ہے
نہ جانے دل خیال حلقۂ زلفوں میں ہے کس کے
کہ جی جاتا ہے میرا یار ہر دم مشک سا پس کے
تری آنکھوں کے وصف اے خوش نگہ جب جب لکھتا ہوں
قلم کو ڈال کر لیتا ہوں چن چن پھول نرگس کے

مینہ کے برسنے کی باد چلی ہے اب آنکھوں سے جان بن آنسو چلیں گے
درد کے نیساں کے گوہر غلطاں تو مٹی میں کنکروں سے آہ رلیں گے
تخت جنوں مرا وحشی دیوانوں نے سر پر اٹھائے ہیں شوروں سے عاجز
اب میاں مجنوں بولوں کی موڑ چھلوں کو خرابی سیں آپ ہی جھلیں گے

ضیا

مرزا عطا بیگ، ضیا تخلص۔ اورنگ آباد مبارک بنیاد میں رہتے ہیں۔ اس سے پہلے شاہ سراج سے اپنی شاعری پر اصلاح لیتے تھے۔ فی الحال میر غلام علی آزاد سے اصلاح لیتے ہیں۔ ان کے حالات زندگی پوری طرح سے معلوم نہیں ہیں۔ لیکن یہ بیت جو سننے میں آئی ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ اچھا شعر کہنے والوں میں سے ہیں۔ بیت:

پھول کے منہ پر ستم سیں مارمت دم اے سموم
یہ چراغ خانہ بلبل ہے گل ہو جائے گا

---

۱ انجمن میں اس شاعر کا ترجمہ نہیں ہے۔

احمد گجراتی

احمد گجراتی۔ یہ اس کے اشعار ہیں :

ہوئے دیدار کے طالب خودی سے خود گزر نکلے
نہ پائی راہ دانش میں خروشاں بے خبر نکلے

نشان بے نشاں ہم ملک یک رنگی میں پاتے ہیں
خبر چھوڑی دوئی کا ہم نے جب سے ست نگر نکلے

بھرے دو نین کے چھگلاں صبوری ساتھ نے توشہ
کمر ہمت سے باندھے ہور پرت کی باٹ پر نکلے

نین کے ہاتھ کھپرے، پھیریں درسن کی بھیکیاں کو
نہ پائی ایک در پر بھی بھکاری در بدر نکلے

رہے نادر خیالاں میں، ملے شوریدہ حالاں میں
ہوئے صاحب کمالاں میں کدھر سے آ کدھر نکلے

قاسم مرزا

قاسم مرزا کے کلام سے۔ اس نے بھی اسی قسم اور ایسے ہی قوافی سے غزل کہی ہے۔ معلوم نہیں کہاں کا رہنے والا تھا۔

گلے میں سرکی لٹ سیلی سوال ہے خال کا دانہ
ہوئے جوگی تو کیا یاں واں جدھر نکلے تدھر نکلے

شعوری

شعوری[1] جالاپوری۔ یہ شعر اس کا ہے :

---

[1] نسخہ پیرس میں شعوری کا ترجمہ غیر حاضر ہے

برسات میں نہ دیکھا نظر بھر کر آفتاب
روشن ہے یہ کہ عاشق ہوا تجھ پر آفتاب

فضلی

فضلی[1]، بس سیدھا فضلی۔ اس مثنوی کو بھی ایک نظر دیکھ چکا ہوں شاعر اچھا نہیں تھا۔

رکھا ہوں نیم جاں جاناں تصدق تجھ پہ کرنے کو
کیا سب تن کو میں درپن اجھوں درسن نپائے ہوں

اس شعر کے دونوں مصرعوں کے درمیان تعلق، سبحان اللہ قسم کا ہے۔ چسپیدگی کا تعلق عجیب و غریب ہے کہ قطعی پتہ نہیں چلتا کہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا کہنے کا ارادہ کیا ہے۔

صبائی

صبائی[2] احمد آبادی۔ یہ شعر اس کا ہے :

زر سے ہے آشنائی، زر سے ملے ہے بھائی
زر نئیں تو ہے جدائی دنیا جو ہے سوز رہے

محمود

محمود[3]۔ یہ دو اشعار اس کے ہیں :

دوگاں کہیں پتھر سے کچھ سخت نہیں لیکن
جو کوئی پیا سے بچھڑا وہ سخت ہے پتھر سے

محمود تجھ میں دستا پورا ہنر وفا کا
ہے کیا عجب جو بھاوے تو پیو کو اس ہنر سے

۱، ۲، ۳ نسخۂ پیرس میں فضلی، صبائی اور محمود کے ترجمے نہیں ہیں

سالک

سالک[۱]۔ یہ شعر اس کا ہے :

پھروں بے ہوش ہو کر میں برہنہ پا بدل تیرے
یقیں بوجھوں تمن پیارے کو سالک کو بھایا ہے

ملک

ملک[۲]۔ یہ شعر اس کا ہے :

تن من فدا کروں، اس ہُشیار ساقیا پر
یک قطرہ مے چکھا کر جن بے خبر کیا ہے

لطفی

لطفی[۳]۔ یہ اشعار اس کے ہیں :

تجھ عشق کی اگن سے شعلہ ہو جل اٹھا جیو
دل موم کے نمونے گل گل پگھل گیا ہے
جیو کا چمن جلا سو جلتی انگارے کر
اکلا کے آگ دینے ٹیسو جنگل گیا ہے
ئیں عشق کی گلی میں گھائل پڑا تھا تس پر
جوبن کا ماتا آ کر مجکو کھنڈل گیا ہے

فخری

فخری[۴]۔ یہ شعر اس کا ہے :

دیکھوں ئیں جب تجھے تو چکا چوند لگ رہے
ہرگز کہنے نہ دیکھا نظر بھر کر آفتاب

۱، ۲، ۳، ۴۔ نسخۂ پیرس میں سالک، ملک، لطفی، فخری کا ذکر نہیں ہے

ہاشم

ہاشم[۱]۔ یہ شعر اس کا ہے :

دکھن ہور ہند کے دلبر ہمن سے بے حجاب اچھے
کہ مکھڑے چاند سے پر جن کے خط پُر پیچ و تاب اچھے

ہاتفی

ہاتفی[۲]۔ یہ شعر اس کا ہے :

تیری انکھیاں ہور زلف سے کافر ہوا سارا جہاں
اسلام ہور تقویٰ کہاں، زہد اور مسلمانی کدھر

اشرف

اشرف[۳]۔ یہ شعر اس کا ہے :

پیا بن میرے تیں بیراگ بھایا ہے جو ہونی ہے سو ہو جاوے
بھبھوت اب جوگیوں کا رنگ لایا ہے جو ہونی ہے سو ہو جاوے

غواصی

غواصی[۴]۔ یہ شعر اس کا ہے :

جو کوئی اس مزرع دل پر برہ کا بیج بوتا ہے
تو ہرگز اس کے بستاں میں گل امید ہوتا ہے

خوشنود

خوشنود[۵]۔ یہ اس کا شعر ہے :

۱، ۲، ۳، ۴، ۵۔ نسخۂ پیرس میں ہاشم، ہاتفی، اشرف، غواصی اور خوشنود کا حوالہ نہیں ہے

سب رین جاگے سحر پڑھ تو بھی سجن آیا نہیں
جب جب کے دیکھی باٹ میں درشن کو دکھلایا نہیں

جعفر

جعفرؔ۔ یہ شعر اس کا ہے:

غمزیاں سوں دیکھو شوخ مجھے مار کر چلے
مجروح تسن پہ راہ منیں ٹھار کر چلے

عبدالرحیم

عبدالرحیمؔ۔ یہ شعر اس کا ہے:

آیا فراق اب پیو کا سُدھ بدھ گنوا مجنوں کیا
جس باٹ وہ پیلے گئی اس باٹ مجھ جانا پڑا

عبدالبر

عبدالبرؔ۔ یہ شعر اس کا ہے:

سجن کے ہجر کا نیزا جگر کے بیچ لاگا ہے
نہ چھٹنگے کیونکے اب طالع کر سنوا نپہ جاگا ہے

عزیزاللہ

عزیزاللہؔ۔ اس نے ایک ایسی غزل کہی ہے کہ اس میں تمام اولیاء اللہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کا مقطع یہ ہے:

یہ نوجواں میں کیا سکت بولوں جو ولیاں کے صفت
عاجز عزیزاللہ اوپر دکھن کے سب پیراں مدد

۱،۲،۳،۴ نسخۂ پیرس میں جعفر، عبدالرحیم، عبدالبر، عزیزاللہ کے ترجمے نہیں ہیں

سعدی

سعدیؔ دکھنی۔ حالانکہ بعضوں نے اس پر شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا گمان کیا ہے مگر یہ غلط ہے۔ کیونکہ یہ الگ شخص ہے۔ یہ اشعار اس کے ہیں:

ہمنا تمن کو دل دیا تم نے لیا اور دکھ دیا
تم یہ کیا، ہم وہ کیا، ایسی بھلی یہ ریت ہے
دو نین کے کچھر کروں، رو رو سخون دل بھروں
پیش سگ کو بیت دھروں پیا سانجلے میت ہے
سعدی غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ
در ریختہ در ریختہ ہم شعر ہے، ہم گیت ہے

بےچارہ

بیچارہؔ۔ یہ شعر اس کا ہے:

سر سے جدا ہونا نہ تھا، چاہا خدا کا یوں اٹھا
جز صبر اب چارہ نہیں بےچارہ ہو رہنا پڑا

حسن

حسنؔ۔ یہ شعر اس کا ہے:

جب تے سفر پی نے کیا تب تے غریب آوارہ ہوں
پی بیگ تے آنا کریں یا مجکو بیں بلوائے کر

حسیب

حسیبؔ تخلص۔ اس کا احوال معلوم نہیں ہے۔ سید عبدالولی صاحب مذکور کی بیاض سے لکھ دیا گیا ہے۔

۱،۲،۳،۴ نسخۂ پیرس میں سعدی، بےچارہ، حسن، حسیب کا ذکر نہیں ہے۔

گلبدن پھول کی مت توڑ کے ڈالی آرے
دیکھ ابھی شور کریں بلبل و مالی آرے[1]

داؤد

مرزا داؤد[2]، داؤد تخلص کرتا ہے۔ سید صاحب کا شاگرد ہے۔ سید صاحب کی زبانی یہ حال معلوم ہوا ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ بہر حال مصرع ٹھیک سے موزوں کرتا ہے۔ یہ شعر اس کا ہے:

زلف دلبر سے مجکو سودا ہے
خلق کہتی ہے تجکو سودا ہے

میر میران

میر میران صاحب، جو سید نوازش خاں خطاب رکھتا ہے اور بھید[3] اس کا تخلص ہے۔ بس اتنا ہی معلوم ہوا ہے۔ یہی دو بیت سننے میں آئے ہیں:

آ دگر باغ سیں وہ سرو خراماں گزرے
اشک قمری سے گلستان میں طوفان گزرے
بسکہ ہے آتشِ غم تیز دردنے میں مرے
ناوک ناز ترا دل سے نہ سوزاں گزرے

تجرد

میر عبداللہ، تجرد تخلص۔ یہ شخص طالب علم ہے۔ سید عبدالولی صاحب فرماتے ہیں کہ میرا شاگرد ہے۔ یہ شعر اس کا ہے:

---

[1] انجمن: گلبدن پھول کی مت لڑکے ڈالی اڑے ، دیکھ ابھی شور کریں بلبل و مالی 'ارے'
[2] نسخۂ پیرس میں مرزا داؤد کا ذکر نہیں ہے۔
[3] شروانی: سید، شورش فہمید

یونس

حکیم یونس۔ اس کے حالات معلوم نہیں ہیں کہ کہاں کا ہے۔ جناب سید صاحب کی بیاض سے لکھ رہا ہوں:

صبح جب گلشن سے وہ گل رو گیا
باغ سے باہر نکل گل رو گیا
ہے معطراب تلک صحرا تمام
اس زمیں اوپر کوئی گل بو گیا
سو گیا جن نے جگایا تھا مجھے
بخت میرا جاگ اٹھا تھا سو گیا

موزوں

نواب[1] خواجم قلی خاں۔ برہان پور کا ہفت ہزاری صوبہ دار ہے۔ سید صاحب (عزلت) کے معتقدین میں سے ہے۔ یہ شعر اس کا ہے:

موزوں نیں راہِ عشق میں پھر اب قدم رکھا
ہے مصلحت سے دور نجانوں کرے گا کیا

حزیں

میر محمد[2] باقر، حزیں تخلص۔ ریختہ کا شاعر ہے۔ صاحب دیوان۔ مرزا مظہر جان جاں کے پرستاروں کا کہنا ہے کہ بنگال گیا۔ باقی حالات ٹھیک سے معلوم نہیں۔ یہ اشعار اس کے ہیں[3]:

اس بے وفا کے عشق میں کچھ مجکو جس نہیں
پاؤں تلک بھی ہائے مجھے دسترس نہیں
جس دن سے ہم سنا ہے کہ آخر ہوئی بہار
اُس دن سے چھوٹنے کی ہمیں کچھ ہوس نہیں

---

[1] نسخہ پیرس میں خواجم قلی خاں کا ذکر نہیں ہے۔
[2] پیرس: محمد علی — کاتب کا سہو معلوم ہوتا ہے۔
[3] نسخہ انجمن میں صرف پہلا شعر ہے۔

ویراں ہوئے خزاں سے چمن یہاں تلک کہ ہم
چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں
بلبل پکارتی تھی اسیران گل کے ساتھ
آئی بہار ہائے چمن میں قفس نہیں
توفیق دے کہ شور سے یکدم بھی چپ رہے
آخر میرا یو دل ہے الٰہی جرس نہیں
کیا ان دنوں میں دھوم مچاتے تھے اگلے سال
جاتی ہے یوں بہار حزیں ہائے بس نہیں

یاد اب کیوں کر نہ آوے مجکو اپنا گلستاں
ایک دن سکھ سے نہ گزرا جب سے چھوڑا آشیاں
ٹک تو اے گل رحم سے بلبل کی کر خاطر نشاں
شوق کے مارے کوئی دم میں ابھی دیتی ہے جاں
دور سے بھی دیکھنے گل کو نہیں دیتا ہے ہائے
اس قدر کرتا ہے مجھ پر جور تو اے باغباں
اے حزیں بلبل کے دل پر باغباں کے جور سے
کیا کیا گزری ہوگی ساعت جلا ہے آشیاں

حشمت

محمد علی حشمت، غنی بیگ تخلص قبول کے شاگردوں میں سے ہے۔ اکثر لوگوں کے اشعار پر بے جا اعتراض کرتا اور موزوں جواب پاتا۔ ریختہ کی شاعری میں بڑا پاجی پن کرتا تھا، گپیں مارتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ عجیب وغریب

۱؎ پیرس: اور ایسی ہی سنتا بھی تھا۔

ہنگامہ باز آدمی تھا۔ آجکل اس کے جیسا بھی کوئی نہیں دکھائی دیتا۔ قطب الدین خاں کے ہمراہ روہیلوں کی جنگ میں قتل ہوگیا۔ عبدالحی تاباں کا استاد تھا۔ خدا اس کی مغفرت کرے۔ یہ اس اشعار اس کے ہیں:

جب آ خزاں چمن میں ہوئی آشنائے گل
تب عندلیب رو کے پکاری کہ ہائے گل

خط نیں ترا حسن سب اوڑا دیا   یہ سبز قدم کہاں سے آیا

تاباں

میر عبدالحی تاباں۔ پُر لطف نوجوان تھا۔ نجیب الطرفین سید تھا۔ شاہ جہاں آباد میں پیدا ہوا۔ بہت اچھا شاعر، خوب صورت، عمدہ اخلاق والا (ملنسار)، پاکیزہ سیرت، محبوب شخصیت، محبت کرنے والا۔ آج تک شاعروں کے فرقے یا زمرے میں ایسے اچھے مزاج اور پسندیدہ صفات کا شاعر عدم کے بطون سے عالم ظہور میں جلوہ گر نہیں ہوا تھا۔ اس کی زبان میں رنگینی اور پاکیزگی گلاب کی پنکھڑی سے بڑھ کر تھی، گلستانِ سخن کا نازک دماغ بلبل، اس کی فکر رنگیں کا اسپ تازی موسم بہار کی پھولوں کی خوشبو سے مہکتی ہوا کے گویا قدم بقدم چلتا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس کی شاعری کا میدان گل کو بلبل کے لفظوں میں ہی ختم ہے لیکن پھر بھی اس کی شاعری بہت رنگین ہے۔ آگ کے رنگ (سرخ) کو دیکھ کر بے اختیارانہ مجھے اس کا کلام یاد آجاتا ہے اور منہ سے توصیف نکلنے لگتی ہے۔ اس کی شاعری کو مدنظر رکھیں تو اس کا استاد حشمت اس کی شاگردی کے لائق بھی نہیں دکھائی دیتا۔

فقیر کے ساتھ اس کی ایک معاملہ میں صفائی رہ گئی۔ کچھ مدت سے اس کے ساتھ اس ہیچ مداں کا ملنا جلنا کم ہوجانے کی وجہ سے ایک طرح کی کدورت درمیان میں آگئی تھی۔ اس کی اجل نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ اس کی تلافی ہو پاتی، تدارک ہو جاتا۔

آخر آخر حالانکہ ابھی اس کی جوانی کا آغاز ہی تھا اس قدر شراب نوشی اس عزیز نے اختیار کی کہ تمام احباب سے ملنا جلنا موقوف ہوگیا۔ اکثر اوقات احباب جب اس کے مکان پر جاتے تو اس کو مست و مدہوش پاتے تھے۔ اس وجہ سے دوستوں نے بظاہر اس سے ملنا ختم کر دیا تھا، اور انجان بن گئے تھے۔ یہ حقیقت بھی لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی کہ مرنے سے سات آٹھ دن پہلے اس نے ایک مرتبہ (شراب سے) توبہ کر ڈالی اور تمام دوستوں اور جاننے والوں کو اُس نے اس مضمون کے پرچے لکھے کہ "عزیزانِ من! میں نے شراب پینے سے توبہ کرلی ہے۔ تم لوگ گواہ ہو اور میری خبر رکھنے والے ہو کیونکہ شراب کثرتِ استعمال کے باعث میرا مزاج بن گئی ہے، اس کو ترک کرنا گویا موت کے منہ میں جانا ہے پھر بھی میں اب اس کے پاس نہیں جاتا ہوں۔ جو شخص میرے حالات سے بے خبر ہے وہ عقل (اور حقیقت) سے بہت دور ہے۔"

آخر کار وہی سب ہوا کہ جو اس نے کہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی زندگی کا چمکتا ہوا آفتاب بہت جلد غروب ہوگیا۔ ایک عجیب و غریب قابل محبت شخص زمانے نے کھو دیا۔ افسوس، افسوس، افسوس۔ پوری امید ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما دی ہوگی۔ یہ اشعار اس کے کلام سے ہیں:

ہے سوزِ عشق یہاں تئیں مجھ میں بعد مرگ
پروانہ مرغِ روح ہو شمعِ مزار کا

قد حلقہ، کماں اسی حسرت میں ہوگیا
تیر ہدف کبھی، نہ ہماری ہوئی دعا

انگر کو چھپا رکھ میں ئیں دیکھ کے سمجھا
تاباںؔ تو تہہ خاک بھی جلتا ہی رہے گا

پاس تو سوتا ہے چنچل پر گلے لگتا نہیں
منتیں کرتے ہیں ساری رات ہو جاتی ہے صبح

جیو میں آوے سو، کہہ تو تاباںؔ کو
لیس من فیک شمّنا بقبیح

مرا بس ہو تو ہرگز خط نہ آنے دوں ترے لیکن
لکھا قسمت کا کوئی بھی مٹا سکتا ہے کیا قدرت

لگ رہی ہیں ترے عاشق کی جو آنکھیں چھت سے
تجھ کو دیکھا ہے مگر اُن نے لبِ بام کہیں

لے میری خبر چشم مرے یار کی کیوں کر
بیمار عیادت کرے بیمار کی کیوں کر

بال اپنے کھولتا ہے جب تو اے خورشید رو
چاند سے منہ پر ترے اس آن آجاتا ہے ابر

آتا ہے فاتحہ کو جو گل رو رقیب ساتھ
لاتا ہے خار قبر پہ میری بجائے گل

آشنا تو، تو مجھے ہے ایسا جیسا چاہیے
پر جو کچھ دل چاہتا ہے ہائے وہ ہوتا نہیں

ساقی ہو اور چمن ہو مینا ہو اور ہم ہوں
باراں ہوا اور ہوا ہو سبزہ ہو اور ہم ہوں

ایمان و دیں سے تاباںؔ کچھ کام نہیں ہم کو
ساقی ہو اور مے ہو دنیا ہو اور ہم ہوں

ملایا خاک میں گھر کوہ کن کا ہائے خسرو نیں
یہ کیا بات آگئی اس خانماں آباد کے دل میں

جفا تو چاہیے اے شوخ مجھ پہ یہاں تک کر
کہ سب کہیں مجھے رحمت تیری وفا کے تئیں

دیکھنا ان ماہرویاں کا تو اے تاباںؔ نہ چھوڑ
چاہتا ہے گر ہمیشہ نور بینائی کے تئیں

میرے ہم مشربوں میں آ تاباںؔ
رہ چکے ہوں گے حضرت رمضاں

جوں برگِ گل سے باغ میں شبنم ڈھلک پڑے
کیا ہو کہ برگِ تاک سے یوں مے ٹپک پڑے

محفل کے بیچ سُن کے میرے سوزِ دل کا حال
بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک پڑے

کاٹیں ہیں بتاں تاباں جوں شمع زباں میری
یہاں بات کے کہنے کی ہوتی ہے گنہ گاری

سفیدی جو آئے ہے داڑھی میں تیری — سمجھ شیخ یہ تار و پود کفن ہے

شیخ جو حج کو چلا چڑھ کے گدھے پر یارو
زور نہیں، ظلم نہیں عقل کی کوتاہی ہے

رکھتا تھا ایک جیو سو تیرے غم میں جا چکا — آخر تو مجھ کو خاک میں ظالم ملا چکا

دیتا نہیں ہے ساقی اس ابر میں پیالہ
آتا ہے مجھ کو تاباں بے اختیار رونا

گلی میں اپنی رونا دیکھ مجکوں وہ لگا کہنے — کہ کچھ حاصل نہیں ہونے کا ساری عمر رو بیٹھا

تو بال کھول نہایا تھا ایک دن اب تک
ہر ایک موج کو ہے پیچ و تاب دریا میں

ہر ایک کو کیجیو تیروں کا اپنے تو قندیل — کھلائیو نہ مرے استخواں ہما کے تئیں

بہے اشک از بسکہ آنکھوں سے میری — لبِ جو ہوا ہے کنارِ گریباں

ہاتھ بے فائدہ زنداں میں نہ دوڑا مجنوں
طوق ہے تیرے گلے میں یہ گریباں تو نہیں

خوانِ فلک پہ نعمت الوان ہے کہاں — خالی ہیں مہر و ماہ کی دونوں رکابیاں

مرتے ہیں آرزو میں اس وقت آن پہنچو
ٹک تم کو دیکھ لیں ہم! جلدی سے جان پہنچو

میں گورِ غریباں پہ جا کر جو دیکھا — بجز نقشِ پا لوحِ تربت نہیں ہے

نہ پائی خاک بھی تاباں کی ہم نے پھر ظالم
وہ ایک دم ہی ترے روبرو ہوا سو ہوا

آرزو ہی رہی یہ دانۂ تاک — قطرۂ مے کبھو نہ ہو ٹپکا

مرنے کے سے تو نہیں کچھ مرے آثار ہنوز — رحم کر رحم کہ جیتا ہے یہ بیمار ہنوز

کیا ہیں فرض کہ محشر کے تئیں مجھے بخشیں
جو تو نہ ہووے تو فردوس بھی جہنم ہے

ترے پاس عاشق کی عزت کہاں ہے — تجھے بے مروت محبت کہاں ہے
مری گور پر لوگ رکھتے ہیں گل کو — تری دلربائی کی غیرت کہاں ہے

بتاں کیا کروں ناتوانی میں اپنی
مجھے بات کہنے کی طاقت کہاں ہے

میرا جواب نامہ یہاں لکھ چکے پر اب تک — قاصد پھرا نہ لے کر وہاں سے جواب نامہ

گئے نالے ترے برباد مانندِ جرس چپ رہ
اثر دیکھا تری فریاد میں دل ہم نے بس چپ رہ

تری ابرو سے نہ چھوٹے گا مرا دل ہرگز — گوشت ناخن سے بھلا کوئی جدا ہوتا ہے

تو مے پی اس قدر ظالم کہ تجھ کو کیف کم ہووے
ترا بے ہوش ہو جانا ہمارا ہوش کھوتا ہے

بتاں کے شہر نا پرساں میں کوئی کب داد کو پہنچے
مگر وہاں اپنے بندوں کی خدا فریاد کو پہنچے

قیامت مجھ پہ کل کی رات اس کے ہجر نیں لائی
نہ آیا یار میرا آج بھی وہ رات پھر آئی

رُباعی

ہوتا ہوں ترا جو اشتیاقی ساقی — بے خود ہو پکارتا ہوں ساقی ساقی
ہے بند کو خمارِ شب کا، لا صبح ہوئی — شیشہ میں جو کچھ کہ مے ہے باقی ساقی

خاکسار

محمد یار المتخلص بہ خاکسار عرف کلو۔ یہ شخص درگاہ قدم شریف حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خادم ہے۔ ریختہ کی شاعری کرتا ہے اور اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھتا ہے اور بہت اوچھا پن کرتا ہے۔ اپنی بے مائگی سے ریختہ کو مضبوط بنانا چاہتا ہے (یعنی حماقت کے سوا کیا ہے) چنانچہ اس تذکرے کے پیش نظر اس نے ایک تذکرہ اپنے ایک چالیس سالہ معشوق کے نام سے لکھا ہے اور سب سے پہلے اپنے حالات لکھے ہیں۔ اپنے آپ کو خود ہی "سید الشعرا" کا خطاب دیا ہے۔ اس کے سینے میں بے وجہ کینہ کی آگ بھڑک اٹھی ہے اور کباب کی سی بو دے رہی ہے۔ اس قماش کا آدمی جو میرے لیے رسّی بٹتا ہے (یعنی برائی کرتا ہے) تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ رسّی بٹنے والے کا بیٹا ہوگا۔

محمد معشوق کنبوہ ایک شخص میر بحر کا نائب ہے۔ بہت ملنسار اور یار باش آدمی ہے۔ اس نے جو سنا کہ خاکسار کا نام کلو ہے تو فی البدیہہ کہہ دیا۔ ع

کتّا ہے دربار کا کلو اس کا نام

کیونکہ کلو اکثر کتّوں کا نام سننے میں آتا ہے، اسی سے لطف بھی پیدا ہوگیا۔

جو اس کی اکڑ فوں دیکھتا ہے (حقیقت) سمجھ جاتا ہے۔ اس کا سارا غرور ریختہ پر ہی ہے، تماشہ یہ ہے کہ ریختہ بھی ڈھیلا ڈھالا اور خود بھی غلط سلط ہے۔ ہر بات میں مرزا جان جاں مظہر کا اتباع کرتا ہے۔ اس کے باوجود حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔

اگر کوئی شعر خوانی کو بلائے تو کہتا ہے "اس وقت طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آہ میری آہ میں ایسا رنگ ہے ویسا رنگ ہے، سبحان اللہ لوگ اس کو شاعری کا نام دیتے ہیں۔ بابا! میں شاعری نہیں کرتا اور وہ بھی ان برادرانِ یوسف کے ساتھ۔ ہمارے شعر بس ایسے ہی تو ہیں، ان کے ساتھ میں کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا، مجھے تو معاف فرمائیے دو شعر پڑھنے نہیں آسکوں گا"

قصہ مختصر یہ کہ بڑا اُتھرا اور سطحی قسم کا آدمی ہے۔

یہ چند اشعار جو اس کے نام سے یہاں لکھے جارہے ہیں دراصل فیض سخن ہے اس کے نہیں ہیں:

دل شیفتہ ہو کے کیا پایا تیں — اے خانہ خراب کیا کیا تیں

تیری زلف سیہ سے اے پیارے — مجھ کو یک سر ہزار سودا ہے

خاکسار اس کی تو آنکھوں کے کنے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

اس فن کو برتنے والے جانتے ہیں کہ یہاں "بیمار کیا کے بجائے گرفتار کیا" آنا چاہئے تھا۔

تیغ قاتل سے موئے ز دم بے تقصیر ہم — روز محشر کے اٹھیں گے گور سے دل گیر ہم

کیا ہے اس خاکسار کی تقصیر — یہ مگر تم کو پیار کرتا ہے

کیا ہے حاصل تجھے ناصح مرے سمجھانے میں
آہ جوں شمع ہے راحت مجھے مرجانے میں

خاکسار عاشق مے خوار کو تقویٰ سے کیا
ابھی دیکھا تھا اس رند کو مے خانے میں

قیامت بھی ہوگی تو میری بلا سے — مجھے داد خواہی کی طاقت کہاں ہے

واسطے یمن کے جا سیل سے لیوے گل کو
گھر ترے خانہ خرابوں سے جو بنیاد کرے

رونے سے خاکسار کے سوتا نہیں کوئی — اس خانماں خراب کو چنگا خدا کرے

عشوہ و ناز کو ترے پیارے — یہ ترا خاکسار جانے ہے

شانہ آہستہ کیجیو حجام
تار اس زلف کا رگ جاں ہے

دردمند

محمد فقیہہ دردمند تخلص۔ حالانکہ اس سے ایک بار مل چکا ہوں، اس کے

حالات اچھی طرح نہیں جانتا، اتنا البتہ جانتا ہوں کہ یہ مرزا مظہر کے حلقہ میں رہا ہے اور ان سے مستفید ہوا ہے۔ اس کے اشعار (غزل) فقیر نے کبھی نہیں سُنے مگر ساقی نامہ کے چند بیت جو اس نے اپنے ممدوح کی مدح میں کہے ہیں البتہ سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ بیت اس کے ہیں:

کرے کیوں نہ مشکل دو عالم کی حل — کہ جس کا یداللہ ہے بانہہ بل
کوئی آج اس کے برابر نہیں — وہ سب کچھ ہے الا پیمبر نہیں

کوئی صاحب محمد علی خاں تھے، ان کی تعریف میں کہا ہے:

پڑی اس کی خوبی کی از بسکہ دھوم
لیا ہاتھ قدرت کا صانع نیں چوم

ساقی نامہ کے شروع میں کہتا ہے:

ارے ساقی اے جانِ فصلِ بہار — یہی تھا ہمارا دتیرا قرار
ہمارے بسرنے کی یہ فصل نہیں — فراموش کرنے کی یہ فصل نہیں

قسمیہ میں کہتا ہے: تجھے وعدہ کر بھول جانے کی سوں
تجھے اپنی سوگند کھانے کی سوں

فخریہ میں کہتا ہے:

تری جان کی سوں غنیمت ہوں میں — سلیقوں میں ظالم قیامت ہوں میں
مرا عقل میں کون انباز ہے — ارسطو مرا ایک دوا ساز ہے
فلک چرخ مارے گا گر صد ہزار — نہ لاوے گا مجھ سا کوئی روزگار

اشتیاق میں کہتا ہے:

نہ بیرے نہ یہ باغ رہ جائے گا
نہ ملنے کا یہ داغ رہ جائے گا

عاصمی

خواجہ برہان الدین، عاصمی تخلص۔ ریختہ کا شاعر ہے اور مرثیہ بھی

خوب کہتا ہے۔ معقول قسم کا انسان ہے۔ شمشیر شناسی میں زبردست مہارت حاصل ہے۔ شاہ جہان آباد کا باشندہ ہے، بہادر پورہ میں سکونت رکھتا ہے۔ اس کی طبیعت لطیفہ گوئی پر بہت مائل رہتی ہے اور تاریخ کے علم میں بہت مہارت پیدا کرلی ہے۔

زمانہ سے بے نیازی رکھنے والوں میں سے ہے حالانکہ زمانہ اس کے ساتھ موافقت نہیں کرتا، خدا اس کو زندہ سلامت رکھے۔ یہ اشعار اس کے ہیں:

چمن کے تخت پر جس دم شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اور شور تھا غل تھا
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں
بتایا باغباں رو رو کے یہاں غنچہ تھا، وہاں گل تھا

رات کو ہیں شمع کی مانند رو کر رہ گیا
صبح کو دیکھا تو سب تن اشک ہو کر بہہ گیا

شوق

میاں حسن علی، شوق تخلص۔ شاہ جہان آباد کا رہنے والا ہے سپاہی پیشہ، ریختہ کا شاعر، خاں صاحب سراج الدین علی خاں کا شاگرد ہے۔ بندہ اس کے ساتھ مکمل تعلق خاطر رکھتا ہے۔ اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے اور باہم مل بیٹھنے کا اتفاق رہتا ہے۔ اس (کے کلام) سے:

قاصد پھرا نہ وہاں سے جواب تک تو آچکا
القصہ اس گلی میں گیا (جو) سو جا چکا
اے یاس مجھ کو کام اجابت سے کیا رہا
وقتے کہ جب دعا ہی سے میں ہاتھ اٹھا چکا

اگر قاصد ترے کوچے سے ٹک جلدی نہ آوے گا
تو پیارے دیکھیو پھر تو کہ میرا جیو ہی جاوے گا

میں اپنی کم زبانی سے عزیزاں گرچہ مرتا ہوں
لبِ زخموں سے قاتل کا ادائے شکر کرتا ہوں
عبورِ بحر دنیا میں سبک ساری سے کرتا ہوں
حباب آسا شمار دم سے بے کشتی گزرتا ہوں
سراپا آرسی ہیں دیدۂ بیدار پر تو بھی
تری اس چشم خواب آلودہ آگے ہو نہیں سکتے
مدت سے یہ بحث درمیاں ہے   پر علم نہیں کمر کہاں ہے
کسی کو باغِ دنیا سے نہ دیکھا شاد ہم جاتے
برنگ شبنم اک عالم یہاں سے چشم تر گزرا
دکھا دیدار اے پیارے کہ میں فرقت سے مر گزرا
مری فردائے محشر آج ہے میں کل سے در گزرا
ماتم میں میرے کوئی نہ رویا تو غم نہیں
تربت پہ میری شمع کا ہنسنا بھی کم نہیں
تر دار کس پہ کھینچتے ہو ہم تو مر چکے
پیاسے ہو کس کے خون کے ہم میں تو دم نہیں
آ چکا خط بھی یہ تیرا نت نیا اک ناز ہے
ہو چکی آخر بہار اور اب نئیں آغاز ہے
خبر لے شوق کی ظالم تری فرقت سے مرتا ہے
بداز تلوار ہے اس پر جو کوئی دم گزرتا ہے

بجھے گی آتش دل ہم نے جانا تھا گھٹا آئی
ہوائے ابر نیں دونی دے یہ آگ بھڑکائی

بجز مروڑ کے عاشق سے کچھ خیال نہیں
ہم اس کی زلف کو پا نا تری ہے سودائی
کیا کیا ستم نہ تھے جو کیے چشم یار نیں   جو سختیاں تھیں مجھ کو زمانہ دکھا چکا
آج ہی ملو تو بہتر وعدہ غلط ہے کل کا
جوں طفل اشک میں تو مہماں ہوں گھڑی پل کا

رسوا

رسوا تخلص کا ایک ہندو شخص تھا۔ فی الحال مذہب کی قید سے آزاد ہے۔ اس سے پہلے بادشاہی توپ خانہ میں نوکری کرتا تھا۔ کچھ مدت سے معاش ترک کر کے گمراہی کے جنگل کا آوارہ گرد ہو گیا ہے۔ اپنی ایک خاص وضع بنائی ہے۔ اکثر[1] چلتے ہوئے راستہ میں دکھائی دے جاتا ہے مستی میں گزار رہا ہے۔ اس سے پہلے ایک ہندو لڑکے پر عاشق تھا حکم خدا سے وہ لڑکا انتقال کر گیا اور اس کا عشق ہوس میں بدل گیا۔ حال یہ ہے کہ شراب پیتا ہے اور اپنی مستی کا احوال تمام لوگوں کو دکھاتا ہے۔ اسی پردے میں وہ دنیا بھر کی آبرو ریزی کرتا ہے اور پھر بھی اپنا سر سلامت لے جاتا ہے۔ عریانی کو اس نے اپنا لباس بنا لیا ہے اور یوں ہی گھومتا پھرتا ہے۔ آخر کار اس تمام ننگے پن میں ہی زندگی کا لباس اختیار کیے ہے۔ چند اشعار اس کے لکھے جا رہے ہیں۔ یہ اشعار اس کے ہیں:

شمع بل جاتی ہے جلتے دیکھ پروانے کتیں
موم دل ہے کیوں (نہ) جلے اپنے دیوانے کتیں
گو زخم میرے دل کا نہ سیوے میرا میاں
میں مر گیا تو کیا ہوا جیوے میرا میاں
قفس سے دوں گئے ہم اور چمن میں جائے نہیں
اڑیں تو پر نہیں رکھتے چلیں تو پائے نہیں

---

[1] پیرس: اکثر چلتے ہوئے راہ میں مست اور بے حواس دکھائی دیتا ہے۔

وصل میں بیخود رہے اور ہجر میں بیتاب ہو
اس دیوانے دل کو رشتو کس طرح سمجھائیے

ہر گلی میں گر پڑیں ہیں مست ہو دیوار و در
ابر رحمت برستا ہے یا برستی ہے شراب

آرام تو کہاں کہ ٹک ایک سو کے چپ رہیں
آنسو بھی نہیں ہے کہ بھلا رو کے چپ رہیں

قایم

محمد قایم المتخلص بہ قایم۔ اچھا جوان ہے۔ اس کے طور طریق سے آنکھیں روشن ہوتی ہیں، حسن پرست ہے، نوکر پیشہ ہے۔

ایک مدت تک میاں خواجہ میر صاحب کے حلقہ میں شامل رہا، اب مرزا محمد رفیع سودا کے ساتھ اس کا انجام منتہی ہو گیا ہے۔ فقیر سے بھی دوستی ہے۔ اس کی شاعری کیفیت سے خالی ہرگز نہیں ہے۔ خدا اس کو زندہ سلامت رکھے۔ یہ اشعار اس کے ہیں:

دریا ہی پھر تو نام ہے ہر ایک حباب کا — اٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا
کیوں چھوڑتے ہو دُرد تہہ جام مے کشو — ذرہ ہے یہ بھی آخر اسی آفتاب کا

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا — آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
جا ہے ماتم کو نت مرے دل میں — اس نگر سے دہا نہیں جاتا
ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم — کیا کروں پر رہا نہیں جاتا

بلبلاں کا اگر جو درد سنے — باغباں پھر چمن کے گل نہ چُنے
جس کا عاشق پتنگ سا جل جائے — شمع کیوں کر کہو کہ سر نہ دُھنے

یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام کسی کا — پر دیکھیو لینا نہ کبھو نام کسی کا

الٰہی واقعی اتنا ہی بد ہے فسق و فجور
پر اس مزہ کو سمجھتا جو تو بشر ہوتا

بناوے کوئی عمارت تو کس توقع پر — پڑا ہے قصر فریدوں بن آدمی سونا
نیک و بد جو تجھے کرنا ہے سو کرے قایم
پھر اب امید نہیں ہے کہ جواں ہووے گا

کو نوحہ گر کو خاک پہ میری ہو گرم شور — تھا اک چراغ گور سو وہ بھی خموش تھا
ہم سے بے بال و پر اب جائیں کدھر اے صیاد
کاش نیں ذبح کیا ہوتا کہ آزاد کیا
یکد گر جب خفگی آئی تو جھگڑا کیا ہے — تجکو خواہندہ بہت مجکو طرحدار بہت

بھلا اے ابر مژگاں اب تو بس کر — ابھی تو کھل گیا تھا تو برس کر
بہار عمر ہے قایم کوئی دن — اسے جوں گل پیارے کاٹ ہنس کر
دامن نہ کھینچ خاک سے میری اے شعلہ خو
پُر بے قرار ہے ہوس سوختن ہنوز
اے محنت آزمائے عاشق — تب خوش ہو کہ مر ہی جائے عاشق
ہمارے درد دل کے تئیں یہ کب بے درد پوچھیں ہیں
ہم اپنے جیو سے عاجز ہیں انھوں کو عیش سوجھیں ہیں
روکے ہے کون تیغ مری عشق نیں کہا
بولا ادھر سے داغ جگر لے سپر کہ ہم

نہ دل بھرا ہے نہ اب نم رہا ہے آنکھوں میں
کبھی جو روئے تھے خوں جم رہا ہے آنکھوں میں
موافقت کی بہت شہریوں سے میں لیکن
وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں
وہ محو ہوں کہ مثال حباب آئینہ
جگر سے اشک نکل تھم رہا ہے آنکھوں میں

صحرا پہ گر جلوں مجھے لاوے عتاب میں
کھینچوں ہر ایک خار کو پائے حباب میں

آدے خزاں چمن کی طرف گر میں رو کروں
غنچہ کرے گلوں کو صبا گر میں بو کروں

کھلتی ہے چشم دید کو تیری پہ جوں حباب
اپنے تئیں بن آپ نہ آیا نظر کہیں

رہنے دو میری نعش کو ہو جائے تا غبار
لے جائے گی اُڑا کے نسیم سحر کہیں

اے دل برنگ غنچہ نہ مل گل رُخوں سے تو
اپنی گرہ میں ان کے کھلانے کو زر نہیں

دل تو کہے سُننے سے سمجھتا بھی ہے کوئی
جو کچھ کہو تو دیدۂ خانہ خراب کو

میں رہ گزر میں پڑا ہوں برنگ نقش قدم
تیں چھوڑا کس کے بھروسے پہ کارواں مجکو

قطعہ

یارو کیوں بکتے ہو بے فائدہ مجھ سے جاؤ
اتنی کہتے ہو مجھے اتنی اسے سمجھاؤ
وہ نہیں تو کہ تجھے غم ہو کسی عاشق کا
یا کوئی جیو نصیبوں ستی یا مر جاؤ
سنگ کو آب کریں پل میں ہماری باتیں
لیکن افسوس یہی ہے کہ کہاں سنتے ہو

قطعہ

میں کہا خلق تمہاری جو مکر کہتے ہیں
تم بھی کچھ اس کا کہیں ذکر و بیاں سنتے ہو
ہنس کے یوں کہنے لگا خیر اگر ہے یہ بات
ہوئے گی ویسی ہی جیسی کہ وہاں سنتے ہو

راہ پینڈے اسے رکھتا ہوں اگر گھیر کبھو
ہنس کے کہتا ہے مجھے کام ہے اب پھیر کبھو

جیو میں چہلیں تھیں جو کچھ سو تو گئیں یار کے ساتھ
سر پٹکنا ہی پڑا اب در و دیوار کے ساتھ

میں دیوانہ ہوں صدا کا مجھے مت قید کرو
جیو نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

موقوف شغل گریہ مری چشم اگر کرے
اتنا رہے نہ آب کہ لب کوئی تر کرے
پہلے ہی سوجھتی تھی ہمیں اے شب فراق
یہ رات بے طرح ہے خدا ہی سحر کرے

تجھ سے لگی تھیں آنکھیں پھنسا مفت میں یہ دل
تقصیر تھی کسو کی گرفتار ہے کوئی

دہن کو تیرے پایا بات کہتے
ہماری جز رسی میں کیا سخن ہے
نہ لگا دل کو اس کی مژگاں سے
اپنے حق میں تو کانٹے مت بووے

اٹھاوے ستم یا جفا کیا کرے
بچارا یہ دل ایک کیا کیا کرے
میں جاتا ہوں کعبہ سے اب بیر کو
بھلا یہ بھی دیکھوں خدا کیا کرے

دم رنے دیتے ہم قائم کو لیکن
خداوندی سے کچھ چارہ نہیں ہے

یارب کوئی اس چشم کا بیمار نہ ہووے
دشمن کے بھی دشمن کو یہ آزار نہ ہووے

یہ دل وہ جنس ہے کہ دیا گر کہیں اسے
دھڑکا یہی رہا کہ نہ دے باز پس مجھے

مرا کوئی احوال کیا جانتا ہے
جو گزرے ہے مجھ پر خدا جانتا ہے

بہکا پھروں ہوں یہاں میں اکیلا ہر ایک سمت
اے ہمرہان پیش قدم تم کدھر گئے

جی تج چکا ہے جور فروشوں کے ہاتھ سے
دل دیکھنے کو لے کے جو ظالم مکر گئے

افغان وآہ کشتۂ بیداد کیا کرے — جو قتل ہو چکا ہو سو فریاد کیا کرے

رباعی

کیا پشم ہیں دنیا کے یہ سب اہلِ نعیم — بے قدر کریں ہم کو جو دے کر زر و سیم
مسجد میں خدا کو بھی نہ کیجے سجدہ — محراب جو خم نہ ہو برائے تعظیم

دانا

فضل علی، داناؔ تخلص۔ نوکر پیشہ آدمی ہے۔ مبتذل اور لطیفہ باز ہے۔ میاں مضمونؔ کا شاگرد ہے۔ نئے نئے لفظ بہت تلاش کر کے لاتا ہے۔ اصل باشندہ شاہ جہان آباد کا ہے۔

فقیر کے مکان پر ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو جو محفل مشاعرہ مقرر ہے، اتفاق سے ایک بار ہولی کے موسم میں پڑی۔ میاں داناؔ بھی اس میں تشریف رکھتے تھے لیکن اس کا لباس ذرا عجیب و غریب قسم کا تھا۔ سیاہ رنگ کا کرتہ تھا جس کا دامن گھٹنے تک کا تھا کیونکہ ذات شریف اور داڑھی دونوں ہی کا بے حد سیاہ رنگ تھا۔ مرزا رفیع، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، نے غور سے دیکھا اور بولا "یارو ہولی کا ریچھ آیا۔"[1] فارسی زبان میں اس کو خرس ہولی کہا کرتے ہیں۔ ہندستان میں رسم ہے کہ ہولی کے دنوں میں اکثر چھوٹی ذات کے لوگ اور ہندو لڑکے وغیرہ خوشی اور کھیل تماشے کے واسطے ریچھ، بندر، گھوڑے اور اونٹ ایک دوسرے کو بناتے ہیں۔ یہ لطیفہ بہت موقع سے ہوا بلکہ مشکل ہو گیا۔

قصہ مختصر یہ کہ داناؔ عجیب و غریب آدمی ہے۔ کبھی کبھی فقیر کے ساتھ بھی ملاقات

۱ پیرس: اس شریف کا رنگ سیاہ تھا اور داڑھی بھی سیاہ۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ جن کا سابق میں تذکرہ کیا جا چکا ہے، بیٹھے تھے۔ یک لخت اسے دیکھ کر بول دیے کہ یاراں ہولی کا ریچھ آیا۔

ہوتی ہے۔ یہ اشعار اس کے ہیں:

ہر صورت خدا کو دیکھنا عنوان ہے میرا
یہی توحید میں مصرع سر دیوان ہے میرا

دل میں ہر ایک کے سودا ہے خریداری کا
یوسف مصر مگر تو ہی ہے اے یار عزیز

نہ چاٹے خون کو جس روز میرے اس کو فاقہ ہے
رگ گردن سے میری اس کے خنجر کو علاقہ ہے

انسان

اسدیار خاں، انساںؔ تخلص کرتا تھا اور ریختہ کی شاعری بھی کرتا تھا۔ محمد شاہ بادشاہ جس کی آرام گاہ کو اب فردوس برین کہتے ہیں، یہ اس کے عہد میں امرا کی صف میں شامل ہوا۔ بہت شان اور دبدبہ کے ساتھ عمر کا وہ حصہ گزارا۔

اکبر آباد کا باشندہ تھا۔ زمانہ[1] جو نہ کسی کی بگڑی بناتا ہے اور نہ بنائے گا اس کی ہی ناسازگاری کے باعث جلد انتقال کر گیا۔ یہ اشعار اس کے ہیں:

نہ دیکھی ایک جھلک بھی آپ کے تن بیچ اندھوں نیں
اگرچہ ہر بُن مو سے بدن سارا شبکتا ہے

زمیں اور آسماں اور مہر و مہ سب تجھ میں ہیں انساںؔ
نظر بھر دیکھ مشتِ خاک میں کیا کیا جھمکتا ہے

۱ ان دنوں زمانہ کی ناسازگاری کے باعث گوشہ نشین ہوا اور انتقال کر گیا، اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت کرے۔

عارفؔ

محمد عارف، عارفؔ تخلص۔ دہلی دروازے کے قریب رہتا ہے۔ میاں مضمونؔ کا شاگرد ہے۔ نئے لفظ خوب تلاش کرکے لاتا ہے۔ مہینے سال میں ایک آدھ شعر موزوں کرتا ہے۔ اس کی شاعری البتہ لطف سے خالی نہیں ہے۔ فقیر کے ساتھ بھی جان پہچان ہے۔ یہ اشعار اس کے ہیں:

دختر رز کو کہہ کہ اس سے ملے — ورنہ عارف افیم کھاوے گا

ہزاروں معنی باریک آویں دل میں اے عارفؔ
اگر زلف سیہ کا پیچ اس کے منھ پہ کھل جاوے

ہدایتؔ

میاں ہدایت اللہ، ہدایتؔ تخلص۔ دہلی کا رہنے والا ہے۔ ریختہ کو نیک اور مہربان آدمی کی طرز میں کہتا ہے۔ میاں خواجہ میر صاحب کے عزیز دوستوں میں سے ہے حالانکہ ملنے جلنے میں عجز و انکسار کے ساتھ پیش آتا ہے لیکن شاعری کے میدان میں اس کا بھاری بھرکم قلم، تنے ہوئے بال برابر ستہ چلتا ہے بندہ اس کے انداز و اسلوب سے بہت لطف اندوز ہوتا ہے۔ حق سبحانہ تعالے اس کو زندہ سلامت رکھے۔ یہ اشعار اس کے ہیں:

شہید تیغ ابرو ہے اسیر دام گیسو ہے
ہدایتؔ بھی تو کوئی زور ہی شہدا شکستا ہے

یاد آئی ہی زلف کی ہے قہر — پھر گئی جیو پہ سانپ کی سی لہر

تیری زلفوں کی کچھ چلی تھی بات — روتے ہی گزری آہ ساری رات

حیرت میں ہوں کہ تیرے تئیں اے شب فراق
ظاہر میں دیکھتا ہوں کہ عالم ہے خواب کا

قطعہ بند

بھلا بتاؤ مری جان کچھ ہدایت نیں — تمہارے جور سے شکوہ کبھو کیا ہوگا
مگر یہی نہ کہ بے اختیار ہوکے کبھو — کچھ اور بس نہ چلا ہوگا رو دیا ہوگا

تجھ بن اے خونخوار یہاں ہر دم دم شمشیر ہے
سانس جب پلٹے ہے گویا بازگشتی تیر ہے

بیدارؔ[1]

میاں[2] محمد علی بیدارؔ، نوجوان ہے۔ بڑا مرد آدمی ہے، خوش خلق، ملنسار ہے۔ شاہ جہان آباد کا ہے۔ ریختہ کا شعر بہت صاف اور شستہ (زبان میں) کہتا ہے۔ صاحب دیوان ہے۔ مرزا مرتضیٰ قلی بیگ فراقؔ کے عزیز دوستوں میں سے ہے۔ مرزا فارسی کے اچھے شاعر ہیں۔ اکثر صحبتوں، ملاقاتوں میں فقیر کے ساتھ گرمجوشی سے ملتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ آدمی بڑا رنگین مزاج ہے۔ خدا اس کو زندہ سلامت رکھے۔

بارہا یار سے چاہا کہ ہوں اغیار جدا
لیکن اس گل سے نہ یکدم ہوئے وہ خار جدا

---

[1] بیدارؔ کا ترجمہ پیرس سے نقل کیا گیا ہے۔ اس نسخے میں بیدارؔ کے پالیس اشعار اور ایک رباعی شامل ہیں جب کہ انجمن میں صرف ایک شعر ملتا ہے۔ بیدارؔ کے ترجمے میں بھی قدرے اضافہ ہے۔ انجمن میں ان کا ترجمہ ان الفاظ میں ہے: "بیدارؔ تخلص، جوان آدمی ہے، مرتضیٰ قلی بیگ فراقؔ کے دوستوں میں سے ہے ریختہ کا مصرع درست موزوں کرتا ہے۔ مرتضیٰ قلی بیگ فارسی کا عیار (مربط) شاعر ہے اکثر صحبتوں ملاقاتوں میں فقیر کے ساتھ گرمجوشی سے ملتا ہے۔ بیدارؔ کے کلام سے ہے:"

[2] تذکرہ میں بیدارؔ کا نام میر محمد علی بھی بتایا گیا ہے۔ دیکھیے عمدہ منتخبہ

تیرے رخسار و قد و چشم کے ہیں عاشق زار
گل جدا، سرو جدا، نرگس بیمار جدا
رات کو بزم میں بے روئے درخشاں تیرے
شمع گریاں ہے جدا، دیدۂ بیدار جدا

جس چشم کو نہ ہو تیرا دیدار دیکھنا   پھر اس کو کیا جہاں میں ہے اے یار دیکھنا

سرشک و داغ و غم و درد جاں ستاں دیکھا
تمہارے عشق میں کیا کیا نہ مہرباں دیکھا
نہ کوہکن نے وہ دیکھا کبھو نہ مجنوں نے
تمہارے عشق میں ہم نے جو اے میاں دیکھا
ہزاروں گرچہ ہیں بیمار تیری آنکھوں کے
پر اون میں کوئی بھلا مجھ سا ناتواں دیکھا

کل تیری یاد میں آنسو ہی نہ کچھ گلگوں تھا
پر مژہ پر مرے لخت جگر پرخوں تھا
پاس ناموس حیا تھا کہ نہ روئے اے ابر
ورنہ آنکھوں میں ہمارے بھی بھرا جیحوں تھا

رشک کھاتا ہے چمن دیکھ کے داماں میرا   کم نہیں ابر سے کچھ دیدۂ گریاں میرا
ایسے طالع مرے بیدار کہاں ہیں جو آج   اس شب تاب میں آوے مہ تاباں میرا

مست ہم کو شراب میں رہنا   کچھ کبھو سیر آب میں رہنا
یاد میں اوس کی زلف کے اے دل   کب تئیں پیچ و تاب میں رہنا

جو وہ خورشید طلعت شام کو ہو بام پر ظاہر
نہ ہووے صبح محشر تک خجالت سے قمر ظاہر

چھوٹے اب اوس شعلہ خو کا مجھ سے کیونکر اختلاط
چھوڑ کب سکتا ہے آتش سے [illegible] اختلاط

آتش حسرت پہ ہو جاتے ہیں لخت دل کباب
اس لب میگوں سے جب کرتا ہے ساغر اختلاط

روشن مثال شمع ہزاروں ہیں غم کے داغ
تربت پہ دل جلوں کی نہیں حاجت چراغ

خاک عاشق ہے جو ہووے ہے نثار دامن
اے مری جان تو مت جھاڑ غبار دامن
رشک کھاتا ہے جسے دیکھ کے بستان ارم
اشک بیدار نے کی ایسی بہار دامن

تجھ بن ہے بے قرار دل اے ماہ کیا کروں
کٹتی نہیں ہے ہجر کی شب آہ کیا کروں
نہ دل نہ دلربا نہ مرے جی کتیں قرار
حیراں ہوں ایسے میں مرے اللہ کیا کروں

جلوہ گر شمع رخ یار کہاں ہے کہ نہیں
روشن اوس نور سے وہ کون مکاں ہے کہ نہیں
کیوں اٹھایا ہے صبا نے ترے کوچہ میں غبار
کیا وہاں آج کوئی اشک فشاں ہے کہ نہیں

دل کو میں آج ناصحا اوس کو دیا جو ہو سو ہو
راہ میں عشق کے قدم اب تو رکھا جو ہو سو ہو

صفا[1] الماس و گوہر سے فزوں ہے تیرے دنداں کو
کیا تجھ لب نے ہمرنگ خجالت لعل و مرجاں کو

دیکھ تجھ کاکل مشکیں کی ادائیں شانہ   ہاتھ اٹھا کیوں نہ کرے تجکو دعائیں شانہ
اس کے بھر آئے ترے مرہم کاکل سے زخم   دونوں ہاتھوں ستی لیتا ہے بلائیں شانہ

---

[1] انجمن میں صرف یہی ایک شعر ہے باقی اشعار نسخۂ پیرس سے نقل کیے گئے ہیں

چاہیئے مجھ دل صد چاک کو ہے جائے وہاں — گر بتاں واسطے زلفوں کے کنگھائیں شانہ

حسرت گیسوئے مشکیں میں مرے جو بیدآر — استخواں اوس کے کا لازم ہے بنائیں شانہ

ترے کیا ہاتھ آیا اس ستم سے باغباں سچ کہہ
اوجاڑا کیوں چمن سے بلبلوں کا آشیاں سچ کہہ

نہیں معلوم ہوتا مجکو اس دشنام دینے سے
مزا آتا ہے کیا تجکو ارے شیریں زباں سچ کہہ

گریباں چاک کر اور پاؤں ننگے ہوکے دیوانا
تو ایسے چال سے بیدار جاتا ہے کہاں سچ کہہ

عاشقوں میں جو کوئی کشتۂ کاکل ہووے
اوس کی تربت پہ سدا سبزۂ سنبل ہووے

جس دن تم آکے ہم سے ہم آغوش ہوگئے
شکوے جو دل میں تھے سو فراموش ہوگئے

سلام بھی ہے زمانے میں اور دعا بھی ہے
ہمارے یار نے قاصد سے کچھ کہا بھی ہے

زلف اس رخ پہ صبا سے جو پریشان ہوجائے
سحر و شام بہم دست و گریباں ہوجائے

زاہد اس راہ نہ آمست ہے میخوار کئی — ابھی یہاں چھین لیے جبّہ و دستار کئی

ناتواں مجھ سے بھلا کون ہے انصاف تو کر — چشم فتاں کے ترے گرچہ ہیں بیمار کئی

نشہ میں جی چاہتا ہے بوسہ بازی کیجئے
اتنی رخصت دے دیجئے بندہ نوازی کیجئے

چاہیئے جو کچھ سو ہو پہلے ہی سجدے میں حضور
آپ کو گر کعبۂ دل کا نمازی کیجئے

رُباعی

خورشید سپہر دیں رسول الثقلین — ہیں اون کے علیؓ و فاطمہؓ نور دو عین

فانوس نبوت و ولایت کے بیچ — مانند دو شمع جلوہ گر ہیں حسنینؓ

سلام

میاں نجم الدین علی، سلام تخلص۔ یہ دارالخلافہ (دہلی) کا باشندہ ہے۔ اکبرآباد میں پیدا ہوا تھا۔ میاں شرف الدین علی خاں پیام جن کا احوال لکھا جا چکا ہے، کا فرزند ہے۔ بارباش اور عمدہ شخص ہے[1] مستقل مزاج لائق اور صاحب کردار ہے۔ انسانیت، پاکیزگی اور عظمت جیسی تمام خوبیوں کا حامل ہے۔ فقیر کو اس کے ساتھ تہہ دل سے محبت و یگانگت ہے۔ چنانچہ اکثر اوقات ہم دونوں مل بیٹھ کر شعر کہتے ہیں اور گپ شب کرتے ہیں آپس میں ہنسی مذاق بھی ہوتا رہتا ہے۔ خوب آدمی ہے خدا اس کو زندہ رکھے۔ یہ اشعار اس کے ہیں:

حدیث زلف چشم یار سے پوچھ — درازی رات کی بیمار سے پوچھ

بے تابیو! قسم ہے تمہیں میرے صبر کی
مسلخ میں بعد ذبح تحمل نہ کیجیو

بہار

لالہ ٹیک چند، بہار تخلص۔ آدمی بڑا چست اور مستعد ہے سراج الدین علی خاں صاحب کے عزیز دوستوں میں سے ہے۔ بہت سی کتابوں کا مصنف ہے۔ تفصیل[2] کی طرف میری طبیعت مائل نہیں ہے۔ برہمن رنگین ہے۔ بہار سخن میں اس کے ایک ایک لفظ سے ہزاروں ہزار رنگ معنیٰ کے پھول کھلتے جاتے ہیں۔ فقیر کے ساتھ بھی جان پہچان ہے۔ خدا اس کو ہدایت دے اور اسلام نصیب......

١۔ شورش و پیرس: غیرت دار

٢۔ یعنی بہار کی تصنیفات کی تفصیل نہیں دی جا رہی ہے۔ راقم

وہی ایک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں
کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زنّار کہتے ہیں

اگر جلوہ نہیں ہے کفر کا اسلام میں ظاہر
سلیمانی کے خط کو دیکھ کیوں زنّار کہتے ہیں

اپنا مردم کشی کا زور بیماروں نے کب پایا
غلط کرتے ہیں ان آنکھوں کو جو بیمار کہتے ہیں

تھی زلیخا مبتلا یوسف کی اور لیلیٰ کا قیس
یہ عجیب منظر ہے جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

بندہ کی رائے کے مطابق مصرع ثانی کے آغاز میں جو قریبی اشارہ (یعنی یہ عجب) کام میں لایا گیا ہے اس کے بجائے اگر کلمۂ استعجابیہ حسن کیا، کہا جائے تو شعر مزید واضح ہو جاتا ہے، جیسا کہ میں سمجھ پایا ہوں

سحر یا معجزہ ہے یہ سچ کیوں نہیں کہتا بہار
دم ترا جذبِ اصم سے زور کرتا ہے کرے

ہمیں واعظ ڈراتا کیوں ہے دوزخ کے عذابوں سے
معاصی گو ہمارے بیش ہوں کیا مغفرت کم ہے

سبھی کرتے ہیں دعویٰ خوں کا قسمت ہے تو دیکھیں گے
صفِ محشر میں، ہو گا کس کے دامن ہاتھ قاتل کا

نازو استغنا، عتاب، اعراض سب جاں کاہ ہیں
قرب میں خوباں کے کیا معنی کر دل کو ہو نشاط

حاشیہ سابقہ سے آگے :-

۳ے لفظ رنگین طبیعت کی شوخی کی بجائے تحریر کی رنگینی کا اشارہ ہے۔ راقم

۴ے نسخے میں الفاظ واضح نہیں ہیں۔

نہیں معلوم کیا حکمت ہے شیخ اس آفرینش میں
ہمیں ایسا خرابا تی کیا تجھ کو سنا جاتی

محبت کی قلمرو میں جو جاوے گا تو دیکھے گا
کوئی آرے تلے چیرا کسی کو کوہ پر پٹکا

نثار

میر عبدالرسول نثار، فقیر کے دوستوں میں سے ہے۔ چنانچہ فقیر کے مشورے سے شعر کہتا ہے۔ نجیب الطرفین سید، سعادت مند نوجوان ہے آبائی وطن اکبر آباد ہے۔ فرخ سیر بادشاہ کی بادشاہت کے زمانے میں اکبر آباد میں نیک اور مہربان لوگ دبدبے سے رہا کرتے تھے۔ اس کے بزرگ اسی عہد میں وہاں منصب و ثروت کے ساتھ زندگی کرتے تھے۔ یہ شخص بہت سجا سنورا، سنجیدہ اور فہم و فراست والا ہے۔ فقیر اس کے انداز و اسلوب زندگی سے بہت مسرور ہوتا ہے۔ یہ اشعار اس کے کلام سے ہیں :

جو ہے یعقوب یوسف دیکھنا منظور آنکھوں سے
تو اتنا پھوٹ کر مت رو کہ جائے نور آنکھوں سے

ٹک دیکھ تو چمن کا کیسا ہے ڈھنگ تجھ بن
منہ سے اڑا ہے گل کے گلشن مے [illegible] رنگ تجھ بن

ہر سمت صد تمنا تڑپھیں ہیں خاک و خوں میں
ہے صحن خانہ میرا میدان جنگ تجھ بن

یہاں گل رکھے پھرے ہے دستار پر تو اپنی
وہاں عاشقوں کے سر پر پڑتے [illegible] سنگ تجھ بن

اکثر ہیں دلفگار و لیکن نہ [illegible]س قدر [illegible] کتنے ہیں بے [illegible] رو [illegible] اک قدر

مں وہ ہوں جس کے رشک سے گل ہیں کیا سحر ٹکڑے جگر ہزار ولیکن نہ اس قدر
ہاتھ سے ان جامہ زیبوں کے نکل جاویں گے ہم
یہ گریباں دامن صحرا کو دکھلاویں گے ہم

یہ عزم کس مریض پہ یہ خشم کس پہ شوخ
ایک میں ہوں مضطرب سو تو نبض طپیدہ ہوں
قاصد بہ مقتضا نہیں غیرت کا خط یے
مشتاق پرفشانی رنگ پریدہ ہوں
طوفان خلق ہووے گا اشک ستم زدہ
ایسا نہ ہووے یار کہ میں آب دیدہ ہوں

میر حسن

میر حسن المتخلص بہ حسن، نوجوان ہے، قابلیت والا ہے۔ نوکر پیشہ ہے اکثر بندہ کے مکان پر ہونے والی مجلس (مشاعرہ) میں تشریف لاتا ہے آدمیوں کے طور طریق رکھتا ہے۔ مرزا رفیع سودا سے مشق شعر کرتا ہے۔[1] یہ اشعار اس کے ہیں:

لگتا ہے آج مجکو یہ سارا جہاں خراب شاید کہ رہ گیا ہے کوئی خانماں خراب

قاتل اگر یہ کہہ کرسکتا ہے چھوڑیو
خنجر تو ایک دم کے لیے منہ نہ موڑیو

زکی

جعفر علی خاں زکی۔ آدمی اس دور کے اچھے لوگوں میں سے ہے۔ اس کا وطن شاہ جہاں آباد دہلی ہے۔

[1] مشق سخن کرنا کے معنی ہیں شاعری پر اصلاح لینا۔ راقم

بادشاہ محمد شاہ نے اس سے حقہ کے متعلق مثنوی لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ اس نے چند اشعار موزوں کر دیئے اور زیادہ وہ موزوں نہیں کر پایا اب شیخ محمد حاتم جن کا ذکر لکھا جا چکا ہے، انھوں نے اہتمام کے ساتھ اس مثنوی کو پورا کر دیا ہے اور مثنوی لطف سے ہرگز خالی نہیں ہے۔

چار پانچ سال پہلے جعفر علی خاں کے مکان پر ریختہ کے احباب کا جلسہ ہوا تھا۔ خدا بہتر جانتا ہے کیا بات ہوئی درہم برہم ہو گیا۔

جعفر علی خاں ریختہ کا شعر جستہ جستہ بہت رنگین اور مربوط کہتا ہے۔ اس سے جو اشعار سنے ہیں وہ لکھے جا رہے ہیں۔ یہ اشعار اس کے ہیں:

چمکتے دانت دیکھے یار کے ریختیں جمانے میں
جڑی ہیں گیتیاں الماس کی نیلم کے خانے میں

اپنی ایک مثنوی میں منقبت میں کہتا ہے:

مدح

قضا کے راج کی صنعت گری دیکھ نبیؐ کے آل کی بارہ دری دیکھ
نبی کے آل پر مجھ وار جانا اسی بارہ پلے سے پار جانا

عشق اور آبلے کی تعریف میں کہتا ہے:

برہ کی راہ کے گوہر پھپھولے کہ کانٹے باٹ میں جلتے ہیں تولے

تمکین

میاں صلاح الدین، تمکین تخلص۔ رنگین مزاج، چلبلی طبیعت کا[1]

---

[1] تمکین کا ترجمہ پیرس سے نقل کیا گیا ہے۔ انجمن میں ترجمہ اس طرح ہے: "جوان آدمی، شوکت رکھتا ہے مگر مغرور نہیں ہے۔ یار لوگوں کی اصطلاح میں مرد آدمی ہے درویشانہ مزاج، کسی سے غرض نہیں۔ بہرحال اپنے طریقے سے زندگی کرتا ہے۔"

شان دار نوجوان ہے۔ درویشانہ وضع ہے، کسی سے غرض نہیں رکھتا۔ جس طرح گزرتی ہے ہنسی خوشی گزار رہا ہے۔ یہ اشعار اس کے ہیں :

حسن اور عشق کو جس زور کا ایجاد کیا
مجکو دیوانہ کیا، تجکو پری زاد کیا

جو اب نہ مریئے تو پھر انتظار میں مریئے	خدا خزاں نہ دکھاوے، بہار میں مریئے
تمام عمر شرابیں پیا کیے ساقی	ہزار حیف کہ آخر خمار میں مریئے[1]

جگّن

میاں جگّن حال کے شیر افگن خاں کا خالہ زاد بھائی ہے۔ فقیر کی شاگردی کا دعویٰ کرتا ہے۔ بہر حال شاعری میں دخل رکھتا ہے۔ خدا اس کو زندہ رکھے۔ (اس کا شعر ہے) :

اس دل مریض عشق کو آزار ہی بھلا
چنگا ہو تو ستم ہے یہ بیمار ہی بھلا

غریب

محمد امان اللہ[2]، غریب تخلص۔ یاد ش بخیر بڑے مزے کا دوست تھا بہت خوش لباس و خوش اطوار تھا۔

اس کی زبان میں لکنت ہے۔ اس وجہ سے کبھی کبھی الکن بھی تخلص لے آتا ہے۔ کیونکہ اکثر اوقات وہ مغل پورہ باغات کی سیر کو جاتا۔ اس لیے بندہ اس کو رند[3] باغاتی کہا کرتا تھا:

۱؎ آخری دو اشعار پیرس کے حاشیے پر ہیں۔

۲؎ پیرس : محمد زماں   ۳؎ انجمن : ارنڈ باغاتی

معاش کی تنگی کی وجہ سے قریب دو تین سال ہوئے وہ بنگال کی طرف چلا گیا ہے۔ (اس کا شعر ہے) :

تیری بغل ہی میں دلِ پُر داغ ہے غریب
حسرت چمن کی کاہے کو یہ باغ ہے غریب

محسن

محمد محسن۔ خدا اسے آفات سے محفوظ و مامون رکھے۔ محسن تخلص کرتا ہے۔ فقیر[1] مولف کے بھائی کا فرزند ہے۔ اس کا ذہن بہت مناسبت رکھتا ہے (شاعری کے ساتھ) اور اس کا سلیقہ (شعر گوئی) بھی خاصا درست معلوم ہوتا ہے۔ ریختہ کا مصرع میرے مشورے سے موزوں کرتا ہے۔ اس کا سن[2] ماشاء اللہ بیس برس کا ہونے والا ہے۔ اچھا کہے گا انشاء اللہ۔ یہ اشعار اس کے ہیں :

یوسف مصر پہنچتا ہے کوئی	تجھ سے دلبر عزیز ڈُلہا کو
حرف تیرے عقیق لب کا شوخ	زندہ کرتا ہے نام عیسیٰ کا

دورے[3] گئے وہ کوہکن و قیس کے جو تھے
میرے جنوں کا اب تو زمانہ میں شور ہے
محسن تمام عمر مجھے روتے ہی کٹی
اس غم کدے میں آہ کہیں بھی سرور ہے

مرا رنگِ رو اس قدر زرد ہے	کہ یہاں زعفراں زار بھی گرد ہے
طپش تشنہ لب تڑپے ہے غالباً	دھڑاکے کا دل میں مرے درد ہے

۱؎ پیرس : فقیر کے

۲؎ پیرس : اس کا سن بیس برس ہے۔

۳؎ نسخۂ پیرس میں 'دورے' کا مفہوم 'زمانہ' درج کیا گیا ہے۔

اگر شیخ دوزخ میں گرمی ہے زور　　مرے پاس بھی اک دم سرد ہے

بہتوں کا عاشقی میں یہاں کال ہو گیا ہے
اے دل ابھی سے تیرا یہ حال ہو گیا ہے
ٹک راہ پر تو آؤ اب سیر کو کہ محسن
مانند نقشِ پا کے پامال ہو گیا ہے

تعزیت دار حسرت دل ہے　　یہ جو گریہ کا جامہ آبی ہے
دلِ پُر آبلہ مرا محسن　　رشک آئینہ حبابی ہے

اس کے کوچے میں ہے کچھ نالۂ شبگیر کا چرچا　　دیکھیو کوئی یہاں میرا تو مذکور نہیں
طبع نازک کو مرے ہاتھ میں رکھیو کہ میں　　قیس و فرہاد سا دہقانی و مزدور نہیں

تنک ابروہلی عاشق اُلٹ گئے
تجھے تلوار سے اے شوخ جس سے

کیا جانئے وہ شوخ کدھر ہے کدھر نہیں
ہم کو تو تن بدن کی بھی اپنے خبر نہیں
اس دشت پُر خطر کا میں باشندہ ہوں جہاں
آدم کا ذکر کیا ہے ملک کا گزر نہیں
دل دینے پر ہو جیو تو کرو خانماں خراب
یہ عاشقی ہے شیخ جیو، خالا کا گھر نہیں

مر گیا پوچھی نہ پر تم نے مری زحمت دل
جیو کی جیو ہی میں رہی ہائے مری حسرت دل
مجھ تہیدست کنے کیا تھا کوئی دن آگے
داغ پیسے سے جو ہاتھوں پہ ہیں سب دولت دل
کیا حساب اتنی جفاؤں کا جو میں کھینچوں ہوں
میں گرفتار بلا میں جو ہوا بابت دل

قطعہ

اے دیدہ خاندان تو اپنا ڈبو چکا　　اب رونا تجھے کیا جو کچھ ہونا تھا ہو چکا
محسن نہ رووؤں میں تو بھلا کہہ کے کیا کروں　　اک دل بساط میں تھا میں اس کو بھی کھو چکا

دل مرا وابستۂ زنجیرِ زلفِ یار ہے
ہے تو دیوانہ پر اپنے کام میں ہشیار ہے
اور یہ عاجز تمہارا کچھ نہیں رکھتا مگر
جان برلب آمدہ حاضر ہے گر درکار ہے

ٹک آ کے دیکھ نہیں کچھ بھی حال آنکھوں میں
پھرے ہے اس پہ بھی تیرا خیال آنکھوں میں
نہ پوچھ دخترِ رز کی تو مجھ سے کیفیت
لیے ہی جاتی ہے دل یہ چھنال آنکھوں میں

جاں بلب ہوں بس نکل جائے نہ یہ جان کہیں
دل میں حسرت ہی رہی جاتی ہے آسان کہیں
کب تلک نزع کی حالت میں رہوں میں تجھ بن
ہو بھی اے مردنِ دشوار اب آسان کہیں

جس دن تری گلی سے میں عزم سفر کیا
ہر ایک قدم پہ راہ میں پتھر جگر کیا
بت خانہ کی شکست و درستیٔ کعبہ ہائے
یہ سب کیا پہ شیخ نیں دل میں نہ گھر کیا

رُباعی

جب تخم محبت ہم نے دل میں بویا　　دین و دنیا سے ہاتھ اپنا دھویا

اگر شیخ دوزخ میں گرمی ہے زور　　مرے پاس بھی اک دم سرد ہے

بہتوں کا عاشقی میں یہاں کال ہوگیا ہے
اے دل ابھی سے تیرا یہ حال ہوگیا ہے
ٹک راہ پر تو آؤ اب سیر کو کہ محسن
مانند نقشِ پا کے پامال ہوگیا ہے

تعزیت دار حسرت دل ہے　　یہ جو گریہ کا جامہ آبی ہے
دلِ پُر آبلہ مرا محسن　　رشک آئینہ حبابی ہے

اس کے کوچہ میں ہے کچھ نالۂ شب کا چرچا　　دیکھیو کوئی یہاں میرا تو مذکور نہیں
طبع نازک کو مرے ہاتھ میں رکھیو کہ میں　　قیس و فرہاد سا دہقانی و مزدور نہیں

تنک ابر دہلی عاشق اُلٹ گئے
تجھے تلوار سے اے شوخ جَس ہے

کیا جانئے وہ شوخ کدھر ہے کدھر نہیں
ہم کو تو تن بدن کی بھی اپنے خبر نہیں
اس دشت پُرخطر کا میں باشندہ ہوں جہاں
آدم کا ذکر کیا ہے ملک کا گزر نہیں
دل دینے پر ہو جیو تو کرو خانماں خراب
یہ عاشقی ہے شیخ جیو، خالا کا گھر نہیں

مرگیا پوچھی نہ پر تم نے مری زحمتِ دل
جیو کی جیو ہی میں رہی ہائے مری حسرتِ دل
مجھ تہی دست کہنے کیا تھا کوئی دن آگے
داغ پیسے سے جو ہاتھوں پڑ ہیں سب دولتِ دل
کیا حساب اتنی جفاؤں کا جو میں کھینچوں ہوں
میں گرفتار بلا میں جو ہوا بابت دل

قطعہ

اے دیدہ خاندان تو اپنا ڈبو چکا　　اب رونا تجھے کیا جو کچھ ہونا تھا ہو چکا
محسن نہ رؤوں میں تو بھلا کہہ کے کیا کروں　　ایک دل بساط میں تھا میں اسکو بھی کھو چکا

دل مرا وابستۂ زنجیر زلفِ یار ہے
ہے تو دیوانہ پر اپنے کام میں ہشیار ہے
اور یہ عاجز تمہارا کچھ نہیں رکھتا مگر
جان برلب آمدہ حاضر ہے گر درکار ہے

ٹک آکے دیکھ نہیں کچھ بھی حال آنکھوں میں
پھرے ہے اس پہ بھی تیرا خیال آنکھوں میں
نہ پوچھ دخترِ رز کی تو مجھ سے کیفیت
لیے ہی جاتی ہے دل یہ چھنال آنکھوں میں

جاں بلب ہوں بس نکل جائے نہ یہ جان کہیں
دل میں حسرت ہی رہی جاتی ہے آسان کہیں
کب تلک نزع کی حالت میں رہوں میں تجھ بن
ہو بھی اے مردنِ دشوار اب آسان کہیں
جس دن تری گلی سے میں عزم سفر کیا
ہر ایک قدم پہ راہ میں پتھر جگر کیا
بت خانہ کی شکست و درستی کعبہ ہائے
یہ سب کیا پہ شیخ نہیں دل میں نہ گھر کیا

رُباعی

جب تخم محبت ہم نے دل میں بویا　　دین و دنیا سے ہاتھ اپنا دھویا

اس عشق میں ہوئے خانہ ویراں یارب   دونوں عالم سے ان نے ہم کو کھویا

ضیا

میاں ضیاء الدین، ضیا تخلص۔ اس کا وطن دہلی ہے۔ نوجوان ہے۔ ادب لحاظ والا اور مہذب آدمی ہے۔ متواضع طبیعت کا ہے۔ فقیر کے ساتھ بہت رسم و راہ ہے۔ خدا اس کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ یہ اس کے اشعار ہیں:

جنت کا مت دو مژدہ مجھ خاک میں رلے کو
آرام وہاں بھی معلوم ایسے جلے بلے کو

گریاں و خاک اڑاتا جوں ابر جوں بگولا
صحرا میں تو نے مجنوں وحشی ضیا بھی دیکھا

راقم

بندرابن، راقم تخلص۔ شاہ جہاں آباد کا رہنے والا ہے۔ شاعری پر مرزا رفیع سے اصلاح لیتا ہے۔ اس سے پہلے فقیر کے ساتھ بھی شاعری میں مشورہ کرتا تھا۔ بندہ کے ساتھ میاں ابراہیم کی وجہ سے، جو نوجوان آدمی ہے اور بہت تعلق والا اور قوت دار آدمی ہے، اس سے جان پہچان ہوئی ہے۔ اور میاں ابراہیم ہم شاعروں کے ساتھ خوب دوستی رکھتا ہے یا یوں کہو کہ ہمارے ہی سلیقہ کا آدمی ہے۔ زیر تحریر راقم اور محمد قائم جس کا احوال گزر چکا ہے یہ دونوں ہی ایک انداز کے ہیں۔ یہ اشعار راقم کے ہیں:

یہاں تک قبول خاطر کیجیے تیری جفا کو
تا سب کہیں کہ راقم رحمت تری وفا کو

اس معنی کا شعر میر عبدالحی تاباں مرحوم کے دیوان میں، ردیف کی تبدیلی کے ساتھ مگر انھیں الفاظ میں میں نے پڑھا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ شعر تاباں کا (ہی) ہے کیونکہ وہ عرصہ دراز سے مشق سخن کرتا تھا اور یہ (ابھی) نومشق ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے۔

دل کنج قفس میں کر فریاد بہت رہا   ہنسنے کے تئیں گل کے کر یاد بہت رویا
میرے اعضا میں تجھ کر سے میاں   فرق ہرگز نہیں سر مو کا
ابر تر سے چشم گریاں کم نہیں   موج دریا ہے شکنج آستیں

قطعہ

مژگاں سے دل بچے تو ٹکڑے کرے ہے ابرو
یہ کہہ کے میں نیں اس سے جب دل کی داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہوئے خالی
تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

قطعہ

اے باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض
مجھ کو قسم ہے چھیڑوں اگر برگ و بر کہیں
اتنا ہی چاہتا ہوں کہ میں اور عندلیب
آپس میں درد دل کہیں ٹک بیٹھ کر کہیں

کس کے گلے کے قطرۂ خوں ہیں تہ زمیں
جوں تکمہ اُگتے ہیں گل اورنگ اب تلک

پہنچا نہ آہ درد کو میرے کوئی طبیب
یا رب عجب طرح کا کچھ آزار ہے مجھے

دیکھا نہ ہو جسے میں کوئی سرزمیں نہیں   پر تخم دل ہو سبز جہاں سو کہیں نہیں
سنتے تھے ہم جہاں میں اہل کرم کا ہاتھ   آیا جو دید میں تو کم از آستیں نہیں

مری بد شرابیوں سے کریں توبہ مے گساراں
زہے وہ عمل کہ ہووے سبب نجات یاراں

سنا کن نے حال میرا کہ جوں ابر وہ نہ رویا
رکھے ہے مگر یہ قصہ اثر دعائے یاراں

بیچوں ہوں میں اس پاس یہ دل نیم نگہ کو
اس پر بھی ستم ہے جو خریدار نہ ہووے

اے عشق مجھے کوئی طرح مار — تا یار کہے کہ ہائے عاشق

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں
کہنے کو ہے یہ بات کہ مقدور ہی نہیں

کہتا تھا کون یہ کہ خوشی ہے جہاں کے بیچ
اس بات کا تو یہاں کہیں مذکور ہی نہیں

سنتے ہیں ہم کہ ہوتی ہے جگ میں دوام صبح
ہوگی کبھی اے چرخ ہماری بھی شام صبح

معصیت میری بہت ہے کہ تیری بخشش بیش
اپنی رحمت پہ نظر کر مرے عصیاں کو نہ دیکھ

صیاد کب تو چھوڑے گا مجکو قفس سے آہ
کھٹکے ہے میرے دل میں بہت خار خار باغ

رونے ہیں اس قدر تو جگر اے جگر نہ کر — دیکھا نہ تو نے کچھ کہ دل و دیدہ کیا ہوئے

نامہ کا میرے اس سے لے کر جواب پھرنا — پر واسطے خدا کے قاصد شتاب پھرنا
ایک وے بھی دن تھے یارب جو تھا ہمیں میسر — گلشن میں ساتھ اس کے پیتے شراب پھرنا

کہے کیا درد دل بلبل گلوں سے — اڑا دیتے ہیں اس کی بات ہنس کر
جو چاہے گوہر مقصود اے دل — صدف کی طرح تو پاس نفس کر

کمترین

میاں کمترین سلمہٗ۔ آدمی مست مولا قسم کا ہے۔ اس کے مزاج کا میلان ہزل کی جانب بہت ہے۔ اپنی استعداد کے موافق شعر کہتا ہے۔ بندے نے اس کا کوئی معقول شعر نہیں سنا ہے۔ آدمی اچھا ہے۔

کبھی کبھی مراختہ[1] کی مجلس میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ یہ لفظ مراختہ بروزن مشاعرہ لوگوں نے بنا لیا ہے۔ یہ اشعار اس کے شہر آشوب سے لیے گئے ہیں:

تو خصم گن کر مشلچن نیں کیے — تو بھی نہیں رہتی دو شاخہ بن دیئے
بلا اس مست نغرانی کو تاڑی — اگاڑی اصطبل کے جا پچھاڑی

ایہام

یہ متصدی نہیں ملتے اگر بھانڈوں سے ذاتوں میں
تو کیوں پیسے کماتے ہیں یہ نقلیں کر براتوں میں

ایہام

دیکھو پکوان والی کی مزاخیں
خصم کے روبرو دیتی ہے شاخیں

ایہام

تم پادشاہ پسند ہو ہم کمتریں تمہارے
کے بیر ہم کو دوگے نازک بدن پیارے

کمارن ایک گھڑی بھر چاہ سیں جو اس طرف آوے
میرا دل اوس کا .... چاک ہو جاوے

---

[1] مراختہ بظاہر ریختہ سے بنایا گیا ہے اور میر صاحب کے زمانے میں مروج ہو گیا تھا (مترجم)

قدر

قدر تخلص، آدمی مست مولا قسم کا ہے۔ مذہب و ملت کی قید سے آزاد اور بے دھڑک ہے۔ اوباش وضع ہے۔ اس کی زبان میں گویائی ہے مگر طوطیوں کی زبان سے مشابہ ہے۔ کبھی کبھی شہر کے بازار یا کوچہ میں نظر آجاتا ہے۔ اس کے حالات فقیر کو پوری طرح معلوم نہیں ہیں۔ یہ اس کا شعر ہے:

آئے ہو آج تو رہ جاؤ سجن رات کی رات
لیلۃ القدر سے بہتر ہے ملاقات کی رات

کافر

میر علی نقی[1]۔ یہ شخص سید ہے۔ سپاہی پیشہ ہے۔ کافر تخلص کرتا ہے جس شعر میں تخلص آجاتا ہے اس کو کافر ٹپکہ کا نام دیتا ہے چنانچہ اکثر اوقات مجلس شعر میں جب پڑھتا ہے تو کہتا ہے کہ "صاحب ان دنوں ایک کافر ٹپکہ موزوں ہو گیا ہے"۔

پچھلے دنوں دو تین مہینے اپنے مکان پر ریختہ کی مجلس مقرر کی۔ آخر اس کے اوباشانہ اطوار کی وجہ سے ختم ہو گئی۔

اس کے بزرگ زادہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ فقیر کے ساتھ دلی تعلق رکھتا ہے۔ یہ اشعار اس کے ہیں:

کس کس طرح بتوں کی صورت نیں رنگ پکڑے
کافران انکھڑیوں میں دیکھے ہیں جھگڑے
مستی لگا کے لال کیا مونہہ کو کوسیں
ظالم نے قتل عام کیا کافراں سیں[2]

---

[1] پیرس میں کافر کا ترجمہ صرف ان الفاظ میں ہے: "میر علی نقی، کافر تخلص۔ یہ شخص سید ہے، سپاہی پیشہ ہے، اطوار اوباشوں کے ہیں"۔

[2] اس شعر کے بعد پیرس میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں۔ کافر کا ایک فارسی شعر لکھا جا رہا ہے: چرا بہ آتش سوزاں نہ سوختند مرا ۔ بدست ہیچ تو کافر فروختند مرا

عاجز

عاجز تخلص۔ یہ شخص لوطی ہے۔ پر قبیح قسم کا ہے (یعنی پرواز تخیل سے عاری) میاں کمترین کی ان پر نظر عنایت ہے۔ اکثر حافظ حلیم کے مشاعرے میں دیکھا ہے۔ حافظ حلیم بڑا گرم جوش اور ملنسار شخص ہے۔ حافظ نے استادوں کے بہت عمدہ اشعار اکثر سنے اور دیکھے ہیں اور حافظ حلیم بو اسحاق اطعمہ کے طور پر شعر کہتا ہے اور کبھی کبھی کوئی عمدہ مصرع بھی کہہ جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت حافظ قدس سرہ العزیز کا مصرع تضمین کیا ہے اور ایک مصرع ان کی ہی طرز میں کہہ ڈالا ہے۔

صبا بلطف بگو آں بخیل یار را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ مارا

اور عاجز[1] کے ساتھ یہ عاجز ترین خلائق ذرا بھی کوئی تعلق یا واسطہ نہیں رکھتا ہے۔ یہ شعر اس کا ہے:

دل بغل مارے لیے جاتے ہیں یہ مکتب کے طفل
شیخ سعدی تم بھی اب لے کر گلستاں دوڑیو

میر گھاسی

میر گھاسی[2]، نوجوان آدمی ہے۔ سمجھ بوجھ والا ہے۔ مغل پورہ میں رہتا ہے

---

[1] نسخۂ پیرس میں عاجز کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:
"عاجز تخلص، ایک شخص ہے قوم کا کھتری۔ طبع موزوں رکھتا ہے۔ یہ شعر اس کا ہے: خط سے زیادہ اور ہوا حسن یار کا ۔ آخر خزاں نے کچھ نہ اکھاڑا بہار کا۔
یہی شعر نسخۂ انجمن میں عشاق کے ترجمے میں نقل ہوا ہے۔

[2] میر گھاسی کا ذکر نسخۂ پیرس میں نہیں ہے۔

تخلص سے چونکہ سمجھ کی کمی کا اظہار ہوتا ہے اس لیے غزل میں نہیں لاتا۔ مجھ سے بھی جان پہچان ہے۔ یہ شعر اس کا ہے:

تو ہو اور باغ ہو اور زمزمہ کرنا بلبل
تیری آواز سے جیتا ہوں نہ مرنا بلبل

عُشاق[1]

عشاق ایک شخص ہے۔ قوم کا کھتری ہے۔ ریختہ کے اشعار بہت غیر معیاری انداز کے کہتا ہے۔ اس کا سلیقہ اس کے تخلص سے ظاہر ہے آج کل دوستوں کی محفل میں بھی نہیں آتا، جیسے کہ مر گیا ہو۔ ایک دن میاں صاحب خواجہ میر کے مکان پر ریختہ کا جلسہ ہوا تھا وہاں نظر آیا تھا اور یہ شعر جو یہاں لکھا جا رہا ہے اس کا جو کچھ رتبہ ہے اس کو فیض سخن سمجھنا چاہیے۔ یہ شعر اس کا ہے:

خط[2] سے زیادہ اور ہوا حسن یار کا
آخر خزاں نے کچھ نہ اکھاڑا بہار کا

میر سوز

محمد میر نام ہے، میر تخلص ہے۔ نوجوان آدمی ہے۔ بہت لائق اور اچھی طبیعت والا ہے۔ حالانکہ شاعری میں اس کا اسلوب الگ طرح کا ہے۔ لیکن میرا[3] آدھا تخلص جو اس کو پسند آیا ہے (یعنی اس نے اختیار کیا ہے) تو اس کی جانب سے میرا دل خوش ہے۔ یہ شعر اس کا ہے:

---

[1] تخلص صیغہ واحد میں رکھا جاتا ہے اور عشاق صیغہ جمع میں ہے۔
[2] عشاق کا ذکر نسخۂ پیرس میں نہیں ہے لیکن اس میں یہ شعر عاجز کے ترجمے میں نقل ہوا ہے۔
[3] پیرس: فقیر مولف کا

شہرۂ حسن سے از بسکہ وہ محبوب[1] ہوا
اپنے چہرے سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

بسمل

بسمل[2] تخلص۔ اس مزخرفات (یعنی نکات الشعرا) کو لکھنے سے پہلے اس کا شور سنا تھا۔ پھر معلوم نہیں ہوا کس جگہ تھا اور کہاں چلا گیا۔ یہ اشعار[3] اس کے ہیں:

لہو پی کے رہ گیا بسمل وگرنہ — ملا تا اپنے تئیں وہ خاک و خوں میں
عشق نے خانۂ ویران دل آباد کیا — غم نے اس خاطر محزوں کو مرے شاد کیا
کوئی گھر زخم کا خالی نہ رہا پیکاں سے — ملک دل خوب ترے ظلم نے آباد کیا

ہائے اس دیوانہ دل نے کام کیا بیجا کیا
آپ تو بدنام تھا ہی مجھ کو بھی رسوا کیا
گر یہی ہے دلبری تو خیر مرنا دور نہیں
دل کہاں تم کو دیا دشمن گویا پیدا کیا

جن ترے لب کو لعل فام کیا — مے کو بر جا ہے گر حرام کیا
بندہ دل کا ہوں اپنے نام خدا — سنگ دل بت کو خوب رام کیا
اپنے لخت جگر کو بسمل نے — سبحۂ اشک کا امام کیا

کیا ہے عرس شاید مر گیا ہے کوئی دیوانا
کہ ہے چشم غزالاں سے چراغاں آج ویرانا
محبت میں نہ اتنا چاہیے کم ظرف ہو کوئی
ذرا سی گرم روئی دیکھ جل جاتا ہے پروانہ

---

[1] پیرس: مجحوب
[2] پیرس میں بسمل کا ترجمہ ان الفاظ میں ملتا ہے: "میاں بسمل، ریختہ کا شاعر ہندوستانی ہے۔ اس کا ماضی اور حال پوری طرح معلوم نہیں ہے مجھ کو۔"
[3] انجمن میں بسمل کا صرف ایک شعر ملتا ہے جب کہ پیرس میں ان کے اشعار کی تعداد ۲۱ ہے۔

دل مجروح ہے از بسکہ زخمی لذت غم کا
لہو اترا ہے چشم داغ میں رسن نام مرہم کا

کشاکش زلف کی یہ کچھ ہے اور خط کا غبار ایسا
نہ ہو یارب کسو کا دل پریشاں روزگار ایسا

شکوہ عشق اور شان جنوں کا رعب ہے بسمل
وگرنہ پاؤں پر رکھتا تھا کس کے سر کو خار ایسا

میں جنوں کا نہ اگر سلسلہ جنباں ہوتا   شک نہیں خانۂ زنجیر تو ویراں ہوتا
تب بجا ہوتا ملامت مجھے کرنا ناصح   ہاتھ میرے میں اگر تیرا گریباں ہوتا

اے شوخ جس خدا نے تجھے خوب رو کیا
کچھ مصلحت تو ہوئے گی جو زشت خو کیا

جو نہ دی اے اشک نے آج اس دل پرخوں کی داد
پھر ملے گی حشر کو کیا خاطر محزوں کی داد

تضمین یقین

حال سے بسمل کے غافل ہے جو کہتا ہے یقین
پھر کسی نے بعد مجنوں کے نہ دی ہاموں کی داد

لگتا نہیں نہ دشت نہ گلشن میں ان دنوں
لے جاوے ایسے دل کو کوئی اے خدا کدھر

بسمل جنوں میں آج ترے سر پہ کوئی نہیں
وہ عقل و ہوش تھے جو بڑے آشنا کدھر

زلف تیرے کے نہ تھی جو بھی نمودار ہنوز
تب سے ہوں دام محبت میں گرفتار ہنوز
کرچکا مجکو تو بسمل پہ خدا جانے کیوں
آستیں اپنی چڑھاتا ہے وہ خونخوار ہنوز

شاغل

شاغل تخلص۔ نوجوان شخص تھا۔ کبھی کبھی مصرع موزوں کیا کرتا تھا۔ بسمل کا، جس کا ذکر آچکا ہے، شاگرد تھا۔ بندے نے بھی دو تین مرتبہ دیکھا ہے۔ آج کل کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ شعر اس کا ہے:

جاتی نہیں ہے اس سے کبھی فکر زلف و رخ
شاغل کو روز و شب ہے تیرا ذکر زلف و رخ

بیرنگ

دلاور خاں۔ اس سے پہلے ہمرنگ تخلص کرتا تھا۔ فی الحال بیرنگ ہے اور بیرنگ تخلص میاں یکرنگ کے خوش کرنے کو کیا ہے۔ مصرع ٹھیک موزوں کر لیتا ہے۔ یہ اشعار اس کے ہیں:

یار کا جب خیال آتا ہے   ہوش میرا تمام جاتا ہے

دل کوں تجھ عشق سے قرار نہیں
اب تلک تجکو اعتبار نہیں

نہیں مطلب مجھے کچھ باغباں اور   دیوانہ ہوں میں گل کے رنگ و بو کا
سدا بیدار رہ غفلت سے ہو ترش   مثل مشہور ہے سویا سو چوکا

ہے ہاتھ ترا خون سے عاشق کے گر آلودہ
مہندی سے سجن مت کر بار دگر آلودہ

مفلس کی خبر کب ہے اے سیم بدن تجکو
افشاں سے ترا ماتھا رہتا ہے زر آلودہ

فرہاد کو محنت کی تلخی نہ کبھی ہوتی
شیریں کا جو ایک بوسہ ملتا شکر آلودہ

خط مرا اس نگار نے نہ پڑھا　　کیا لکھا تھا کہ یار نے نہ پڑھا
میں تو لکھتا تھا اس خط کو بیرنگ　　اس تغافل شعار نے نہ پڑھا

قدرت

قدرت اللہ نام ہے اور قدرتؔ تخلص۔ حالانکہ عاجز الکلام ہے لیکن[1] میر محمد عارف کی خاطر کہ جو فقیر کے اچھے دوستوں میں سے ہے، اس کا ذکر لکھ دیا ہے۔ یہ شعر اس کا ہے:

قاصد شتاب جا کے خبر لا تو یار کی　　حالت بنٹھ بری ہے دل بے قرار کی

یکدل

میر عزت اللہ نام ہے اور تخلص یکدلؔ ہے۔ یہ شخص سید ہے۔ شعر و شاعری کا عاشق ہے۔ اکثر مدح اور منقبت میں کہتا تھا۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں نظر آتا تھا۔ فی الحال معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ یہ اشعار اس کے ہیں۔ یہ اشعار میر عارف نے تحقیق کے ساتھ بہم پہونچائے ہیں:

مخمس مدّاح

نو گل باغ اِنّمَا کی قسم　　سرو گلزار ھل اَتٰی کی قسم
میر میدانِ لافتا کی قسم　　میں تو عاشق ہوں مرتضیٰ کی قسم
دل فدا ہے مجھے خدا کی قسم[2]
شاعروں میں نہ میں خیالی ہوں　　والہ و مست ہوں ولا کی قسم

---

[1] پیرس میں عبارت اس طرح ہے:
"کیونکہ فقیر یکرنگ کے دوستوں میں سے ہے اسی باعث اس کا ذکر لکھ دیا ہے۔"

[2] پیرس میں اس مصرع کے بعد "الا (الی) آخرہ" بھی ہے۔

میر

فقیر حقیر میر محمد تقی میرؔ۔ اس کتاب کا مولف ہے۔ اکبر آباد اس کا وطن ہے لیل و نہار کی گردش کے باعث کچھ مدت سے شاہ جہاں آباد میں ہے۔ کچھ مدت خود بخود ہی لکھا گیا ہے۔

(میر مؤلف)

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا
جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوستہ پیکاں تیر کا
جو ترے کوچہ میں آیا پھر نہیں کاڑھا اسے
تشنۂ خوں میں تو ہوں اس خاک دامن گیر کا
کس طرح سے مانیے یاراں کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

شب درد و غم سے عرصہ مرے جیو پہ تنگ تھا
آیا شبِ فراق تھی یا روز جنگ تھا
مت کر عجب جو میرؔ ترے غم میں مر گیا
جینے کا اس مریض کے کوئی بھی ڈھنگ تھا
جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے
ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا
عید آئندہ تک رہے گا گلا　　ہو چکی عید تو گلے نہ ملا
آنکھوں میں جیو مرا ہے ادھر یار دیکھنا
عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا

ہونا نہ چار چشم دل اس ظلم پیشہ سے
ہوشیار، زینہار، خبردار دیکھنا

تجھ سے ہر آن میرے پاس کا آنا ہی گیا
کیا گلا کیجیے غرض اب وہ زمانا ہی گیا

ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئی نسیم
عمر گزری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا

جی گیا میرؔ کا اس لیت و لعل میں لیکن
نہ گیا ظلم ہی تجھ سے یہ بہانا ہی گیا

بھری تھی آگ تیرے درد دل میں میرؔ ایسی تو
کہ کہتے ہی سخن کے روبرو قاصد کا منہ آیا

کف جاناں سے ممکن نہیں رہائی میرؔ کو ہووے
اچنبھا ہے جو اس کے ہاتھ سے رنگ حنا چھوٹا

اب وہ جگر طپش سے تڑپتا ہے تشنہ لب — مدت تلک جو میرؔ کا لوہو پیا کیا

دل میں بھرا ز بسکہ خیال شراب تھا
مانند آئینے کے مرے گھر میں آب تھا

ٹک دیکھ آنکھیں کھول کے اس دم کی حسرتیں
جس دم یہ سوجھے گی کہ یہ عالم بھی خواب تھا

جو اے قاصد وہ پوچھے میرؔ بھی ایدھر کو چلتا تھا
تو کہیو جب چلا ہوں میں تو اس کا جیو نکلتا تھا

نہ گئی تسبیح اس کی نزع میں بھی میرؔ سے ہرگز
اسی کے نام کی سمرن تھی جب منکا ڈھلکتا تھا

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہووے گا
مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

اب تو جاتا ہی ہے کعبے کو بت خانے سے — جلد پھریو تجھے اے میرؔ کو سونپا

ترے عشق سے آگے سودا ہوا تھا — پر اتنا میں ظالم نہ رسوا ہوا تھا

خزاں الفت اس پہ نہ کرنی بجا تھی — یہ غنچہ چمن میں ابھی وا ہوا تھا

کہاں آتے میسر تجھ کو تجھ سے خود نما اتنے — بحسن اتفاق آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

طراوت تھی چمن میں سرو کو یہ رشک قمری سے — ادھر آنکھیں مندی اس کی کہ ادھر آب جو ٹوٹا

شب زخم سینہ او پر چھڑکا نمک میں نمک کو
ناسور تو کہاں تھا ظالم بڑا مزا تھا

آنکھیں کھلیں جب جیو میرؔ کا گیا تب
دیکھے سے تجھ کو ورنہ میرا بھی جیو چلا تھا

ہم نے کہا تھا تیرے تئیں آہ سمجھ نہ ظلم کر — آخر کار بے وفا جیو ہی گیا نہ میرؔ کا

قابو خزاں سے ضعف کا گلشن میں بن گیا
دوش ہوا پہ رنگ گل و یاسمن گیا

برگشتہ بخت دیکھ کے قاصد سفر میں ہے
پہنچا تھا اس کے پاس سو میرے وطن گیا

مر گیا تس پہ سنگسار کیا — نخل ماتم مرا یہ پھل لایا

دیر و حرم میں کیونکے قدم رکھ سکوں میں میرؔ
مجھ سے ایدھر تو بت پھرے اودھر خدا پھرا

جب کہ تابوت مرا جائے شہادت سے اٹھا — شعلۂ آہ دل گرم محبت سے اٹھا

عمر گزری مجھے بیمار ہی رہتے ہے بجا — دل عزیزوں کا اگر میری عیادت سے اٹھا

یک پارہ جیب کا بھی بجا میں نہیں سیا
وحشت میں کوئی سیا سو کہیں کا کہیں سیا

دل پہنچا ہلاکت کو نپٹ کھینچ کسالا — لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ

جس گھر میں ترے جلوے سے ہو چاندنی کا فرش
واں چادر مہتاب ہے مکڑی کا سا جالا

کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث
برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا
بے چارہ گریہ ناک و گریباں دریدہ تھا

حاصل نہ پوچھ باغ شہادت کا بوالہوس
یہاں پھل ہر یک درخت کا حلق بریدہ تھا

مت پوچھ کس طرح سے کٹی رات ہجر کی
ہر نالہ میری جان کو تیغ کشیدہ تھا

خواہ مجھ سے لڑ گیا اب خواہ اس سے مل گیا
کیا کہوں اے ہم نشیں میں تجھ سے حاصل دل گیا

اے نکیلے یہ تھی کہاں کی ادا — کھپ گئی جی میں تیری بانکی ادا
خاک میں مل کے میر اب سمجھے — بے ادائی تھی آسماں کی ادا

سنو ہو جل ہی بجھوں گا کہ ہو رہا ہوں میں
چراغ مضطرب الحال صبح گاہی کا

گرچہ سردار مزوں کا ہے امیری کا مزا — چھوڑ لذات کو اور لے تو فقیری کا مزا
اے کہ آزاد ہے ٹک چکھ نمک مرغ کباب — تا تو جانے کہ یہ ہوتا ہے اسیری کا مزا

موند رکھنا چشم کا ہستی میں عین دید ہے
کچھ نہیں آتا نظر جب آنکھ کھولے ہے حباب

مت ڈھلک مژگاں سے میرے اے سرشک آبدار
مفت ہی جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب

دیکھ خورشید تجھ کو اے محبوب — عرق شرم میں گیا ہے ڈوب
میر شاعر بھی زور کوئی تھا — دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب

دست صیاد تلک بھی میں نہ پہنچا جیتا
بے قراری نے لیا مجھ کو تہہ دام بہت

سہل سوجھیں تجھے دشواریاں عاشق کی آہ
حسرتیں کتنی گرہ تھیں رمق ایک جان کے بیچ

پل میں جہاں کو دیکھتے میرے ڈبو چکا
ایک وقت میں یہ دیدہ بھی طوفان رو چکا

افسوس میرے مردہ پر اتنا نہ کر کہ اب
پچھتاونا عبث ہے جو ہونا تھا ہو چکا

ایک چشمک پیالہ ساقی بہار عمر
جھپکی لگی کہ دور یہ آخر ہی ہو چکا

ہر صبح حادثہ سے یہ کہتا ہے آسمان
دے جام خون میر کو گر منہ وہ دھو چکا

ہیں بھی دنیا میں ہوں ایک نالہ پریشاں یکجا
دل کے سو ٹکڑے میرے اور سبھی نالاں یکجا

سر سے باندھا ہے کفن عشق میں تیرے یعنی
جمع ہم نے بھی کیا ہے سر و ساماں یکجا

گزرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا — خانہ خراب ہو اس جیو کی چاہ کا
آنکھوں میں جیو مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں — مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا
یک قطرہ خون ہو کے مژہ سے ٹپک پڑا — قصہ یہ کچھ ہوا دل غفراں پناہ کا

ظالم زمیں سے لوٹتا دامن سنبھال کے چل
ہو گا کہیں میں ہاتھ کسی داد خواہ کا

کیا طرح ہے آشنا گاہے، گہے نا آشنا — یا تو بیگانہ ہی رہیو ہو جیو یا آشنا
پائمال صد جفا ناحق نہ ہوئے عندلیب — سبزۂ بیگانہ بھی تھا اس چمن کا آشنا

قطعہ

بلبلیں رو رو کے یہ کہتی تھیں ہوتا کاشکے — یک مژہ رنگ قراری اس چمن کا آشنا
گو گل و لالہ کہاں سنبل و سمن اور نسترن — خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

کیا دن تھے مرے کہ یہاں بھی دل آرمیدہ تھا
رو آشیاں طائر رنگ پریدہ تھا

پاؤں پر سے اپنے میرا سر اٹھانے مت جھکو
تیغ باندھی ہے میاں تم نے کمر میں خوش غلاف

سب پہ روشن ہے کہ شب مجلس میں جب آتی ہے شمع
تجھ بھبھوکے سے کو بیٹھا دیکھ بجھ جاتی ہے شمع

بالیں پہ میرے گھر سے تو آوے گا جب تلک
کر جاؤں گا سفر ہی میں دنیا سے تب تلک

اتنا دن اور دل سے تپش کرے کاوشیں
یہ مجلہ تمام ہی ہے آج شب تلک

نقاش کیوں نہ کھینچ سکا تو شبیہہ یار
کھینچوں ہوں ایک ناز ہی اس کے میں اب تلک

فصل خزاں میں سیر کی ہم نے بھی جائے گل
چھانی چمن کی خاک نہ تھا نقش پائے گل

اللہ رے عندلیب کی آواز دل خراش
جیوہی نکل گیا جو کہا ان نے ہائے گل

گل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل
یک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

بھلا تم نقد دل لے کر ہمیں دشمن گنو اب تو
کبھی کچھ ہم بھی کر لیں گے حساب دوستاں در دل

کیا بلبل اسیر ہے بے بال و پر کہ ہم — گل کب رکھے ہے ٹکڑے جگر اسقدر کہ ہم
جیتے ہیں تو دکھادیں گے دعوئ عندلیب — گل بن خزاں میں اب کے وہ رہتی ہے مر کہ ہم

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم — لیک لگ چلنے کو بلا ہیں ہم
آستاں پر ترے گزر گئی عمر — اسی دروازے کے گدا ہیں ہم

تیرے کوچہ میں تا بمرگ رکھا
کشتۂ ملت وفا ہیں ہم

ہم چشم ہے ہر آبلۂ پا کا مرا اشک — از بسکہ تیری راہ میں آنکھوں سے چلا ہوں
دامن نہ جھٹک ہاتھ سے میرے کہ ستمگر — ہوں خاک سر راہ کوئی دم میں ہوا ہوں
آتے ہیں مجھے خوب یہ دونوں ہنر عشق — رونے کے تئیں آندھی ہوں کڑھنے کو بلا ہوں

گر ٹک ہو درد آئینہ کو چرخ زشت میں
ان صورتوں کو صرف کرے خاک وخشت میں

تو گلی میں اس کی جاوے کبھی اے صبا نہ چنداں
کہ گڑے ہوئے پھرا کھڑیں دل چاک دردمنداں

تیرے تیر ناز کے جو یہ ہدف ہوئے ہیں ظالم
مگر آہنیں تو ہے ہیں جگر نیازمنداں

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں
اس غم کدے میں آہ دل خوش کہیں نہیں

آگو تو لعل نوخطِ خوباں کے دم نہ مار — ہرچند اے مسیح وہ باتیں رہیں نہیں

سن گوش دل سے اب تو سمجھ بے خبر کہیں
مذکور ہو چکا ہے مرا حال ہر کہیں

اب فائدہ سراغ سے بلبل کے باغباں
اطراف باغ ہوں گے پڑے مشت پر کہیں

کیا ہیں نے روکر فشار گریباں — رگِ ابر تھا تار تار گریباں

دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں
اب ہم نے بھی کسی سے آنکھیں لڑائیاں ہیں

ٹک سن کہ سو برس کی ناموسِ خامشی کھو
دو چار دن کی باتیں اب منہ پر آئیاں ہیں

مرے آگو نہ شاعر نام پاویں — قیامت کو مگر عرصہ میں آویں
نہ ایک یعقوب رویا اس الم میں — کنواں اندھا ہوا یوسف کے غم میں

تیری زلف سیہ کی یاد میں آنسو ٹپکتے ہیں
اندھیری رات ہے برسات ہے جگنو چمکتے ہیں

عام حکم شراب کرتا ہوں محتسب کو کباب کرتا ہوں
ٹک تو رہ اے بنائے ہستی تو تجھ کو کیسا خراب کرتا ہوں

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندہ میں کچھ رہا نہیں

بوئے گل اور رنگ گل اللہ ہی اللہ ہے نسیم
ایک بقدر یک نگاہ دیکھیے تو وفا نہیں

ایسے محروم گئے ہم تو گرفتار چمن
کہ موئے قید میں دیوار بہ دیوار چمن
سینہ پر داغ کا احوال میں پوچھوں ہوں نسیم
یہ بھی تختہ کبھی ہووے گا سزاوار چمن
خون ٹپکے ہے پڑا نوک سے ہر ایک کے ہنوز
کس ستم دیدہ کے مژگاں ہیں یہ خار چمن

عاشق ہے یا مریض ہے پوچھو تو میر سے
پاتا ہوں زرد زرد بروز اس جواں کو میں

میں وہ پژمردہ سبزہ ہوں کہ ہو کر خاک سے سرزد
یکایک آگیا اس آسماں کی پائمالی میں
مرے استاد کو فردوس اعلیٰ میں ملے جاگہ
نہ سکھلایا بغیر از عشق مجکو خوردسالی میں

آہ اور اشک ہی سدا ہے یہاں روز برسات کی ہوا ہے یہاں
جس جگہ ہو زمین تفتہ سمجھ کہ کوئی دل جلا گڑا ہے یہاں

یہ غلط کہ میں پیا ہوں قدح شراب تجھ بن
نہ گلے سے میرے اترا کبھی قطرہ آب تجھ بن
یہ ہے بستی عاشقوں کی کبھی سیر کرنے چل تو
کہ محلے کے محلے ہیں پڑے خراب تجھ بن

میں لہو پیوں ہوں غم میں عوض شراب ساقی
شب تیغ ہوگئی ہے شب ماہتاب تجھ بن
کٹی عمر میری ساری جیسے شمع باؤ کے بیچ
یہی رونا جلنا گلنا یہی اضطراب تجھ بن

نسیم مصر کد آئی سواد شہر کنعاں کو
کہ پھر جھولی نہ یہاں سے لے گئی گلہائے حیراں کو
کوئی کانٹا سر رہ کا ہماری خاک پر بس ہے
گل گلزار کیا درکار ہے گور غریباں کو
زبان نوحہ گر ہوں میں قضا نے کیا ملایا تھا
میری طینت میں یارب سودۂ دلہائے نالاں کو
گل و سنبل میں نیرنگ قضا مت سرسری گزرے
کہ بگڑے زلف و رخ کیا کیا بناتے اس گلستاں کو
کریں پامال فرش رہ اس ساعت کہ محشر میں
لہو ڈوبا کفن لاویں شہید ناز خوباں کو
صدائے آہ جیو کے پار ہوئی ہے تیر سی شاید
کسی بیدرد نے کھینچا کسی کے دل کے پیکاں کو

کیا سیر اس خرابہ کا بہت اب چل کے سو رہیے
کسو دیوار کے سایہ میں منہ پر لے کے داماں کو

کیا ہے گر بدنامی و حالت تباہی بھی نہ ہو
عشق کیسا جس میں اتنی روسیاہی بھی نہ ہو

جب سے جہاں ہے ہر سحر تیری کروں ہوں جستجو خانہ بخانہ، در بدر، کوچہ بکوچہ، کو بہ کو

آنکھوں سے دل تلک ہیں چنے خوان آرزو
نو امیدیاں ہیں کتنی ہی مہمان آرزو
اس مجہلے کو سیر کروں کب تلک کہ ہے
دست ہزار حسرت و دامان آرزو

دل پر خوں ہے یہاں تجکو گماں ہے شیشہ
شیخ کیوں مست ہوا ہے تو کہاں ہے شیشہ

شیشہ بازی تو ٹک ایک دیکھنے آ آنکھوں کی
ہر مژہ پر مرے اشکوں سے رواں ہے شیشہ

قطعہ

جا کے پوچھا جو میں کل کارگہہ مینا میں
دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گراں ہے شیشہ

کہنے لاگے کہ کدھر بہکا پھرا ہے اے مست
ہر طرح کا جو تو دیکھے ہے کہ یہاں ہے شیشہ

دل ہی سارے تھے یہ اک وقت میں جو کر کے گداز
شکل شیشہ کی بنائیں ہیں کہاں ہے شیشہ

جو ہوشیار ہو سو آج ہو شراب زدہ
زمین میکدہ یک دست ہے گی آب زدہ
بنے یہ کیونکے ملے تو ہی یا ہمیں سمجھیں
ہم اضطراب زدہ اور تو حجاب زدہ

کچھ سنی سوختگاں نے خبر پروانہ — کہتے ہیں اڑ بھی گئے جل کے پر پروانہ
اے جگر تفتگی بے اثر پروانہ — سعی اتنی تو ضروری ہے اٹھے بزم سلگ
بزم دنیا کی تو دل سوزی سنی ہوگی میر
کس طرح شام یہاں ہو سحر پروانہ

اس اسیری کے نہ کوئی اے صبا پالے پڑے — یک نظر گل دیکھنے کے بھی ہمیں لالے پڑے
حسن کو بھی عشق نے آخر کیا حلقہ بگوش — رفتہ رفتہ دلبروں کے کان میں بالے پڑے

اس واسطے کانپوں ہوں کہ ہے آہ نپٹ سرد
یہ باؤ کلیجے کے کہیں پار نہ ہووے

گرے ہے خندہ دنداں نما تو میں بھی روؤں گا
چمکتی زور ہے بجلی مقرر آج باراں ہے
چمن پر نوحہ زاری سے ہے کس گل کا یہ ماتم
جو شبنم ہے تو گریاں ہے جو بلبل ہے تو نالاں ہے

الم سے یاں تئیں میں مشق ناتوانی کی — کہ میری جان نہیں تن پر میرے گرانی کی
چمن کا نام سنا تھا ولے نہ دیکھا ہائے — جہاں میں ہم نے قفس ہی میں زندگانی کی

سمجھے ہے نہ پروانہ تھا ہے ہے زبان شمع — وہ سوختنی ہے تو یہ گردن زدنی ہے
لیتا ہی نکلتا ہے میرا لخت جگر اشک — آنسو نہیں گویا کہ یہ ہیرے کی کنی ہے
اے تیر جگر ٹکڑے ہوا دل کی طپش سے — شاید کہ میرے جیو پر اب آن بنی ہے

گرم ہیں شور سے تجھ حسن کے بازار کئی — رشک سے جلتے ہیں یوسف کے خریدار کئی
اپنے کوچہ میں نکلیو تو سنبھالے دامن — یادگار مژہ میر ہیں وہاں خار کئی

صبح سے بن علاج تو خوش ہے — تیرا بیمار آج تو خوش ہے
میر پھر کہیو سرگزشت اپنی — بارے یہ کہہ مزاج تو خوش ہے

مر ہی جائیں گے بہت ہجر میں ناشاد رہے
بھول تو گئے ہو ہمیں پر یہ تمہیں یاد رہے
ہم سے دیوانہ پھرے بس شہر میں سبحان اللہ
دشت میں قیس پھرے کوہ میں فرہاد رہے

میرے دود دل کا تو یہ جوش ہے — کہ عالم جوان سیہ پوش ہے
گیا رو برو اس کے کیوں آئینہ — کہ بیہوشی اوس کا دم اور ہوش ہے

اچنبھا ہے اگر چپکا رہوں مجھ پر عتاب آوے
وگر قصہ کہوں اپنا تو سنتے اس کو خواب آوے
لپیٹا ہے دل سوزاں کو اپنے میر نے خط میں
الٰہی نامہ بر کو اس کے لے جانے کی تاب آوے

اس دشت میں اے سیل سنبھل ہی کے قدم رکھ
ہر سمت کو یاں دفن مری تشنہ لبی ہے

کاتب کہاں دماغ جواب شکوہ ٹھانیئے
بس ہے یہ ایک حرف کہ مشتاق جانیئے
شب خواب کا لباس ہے عریانی میں یہ
جب سوئیے تو چادر مہتاب تانیئے

کب تلک جیو رکے خفا ہووے — آہ کرنے کی ٹک ہوا ہووے
بے کلی مارے ڈالتی ہے نسیم — دیکھیے اب کے سال کیا ہووے

ہے یہ بازار جنوں منڈی ہے دیوانوں کی
یہاں دوکانیں ہیں کئی چاک گریبانوں کی
خانقہ کا تو نہ کر قصد ٹک اے خانہ خراب
یہی اک رہ گئی ہے بستی مسلمانوں کی
کیوں کہ کہیئے کہ اثر گریۂ مجنوں میں نہ تھا
گرد نمناک ہے اب تک بھی بیابانوں کی

نہیں وسواس جیو گنوانے کے — ہائے رے ذوق دل لگانے کے
میری تغیر حال پر مت جا — اتفاقات ہیں زمانے کے

غافل میں رہا تجھ سے پیٹھ نا بہ جوانی — اے عمر گزشتہ میں تیری قدر نہ جانی
مدت سے ہیں ایک مشت پر آوارہ چمن میں — نکلی ہے یہ کس کی ہوس بال فشانی
یہ جان اگر بید مولہ کہیں دیکھے — رہ گئی ہے کسی موئے پریشاں کی نشانی
بھاتی ہے مجھے اک طلب بوسہ میں یہ آن — تکنت سی الجھ جا کے تجھے بات نہ آنی
بسکہ ہے گردون دوں پرور دنی — ہوئے پیوند زمیں یہ کشتنی
بزم میں سے اب تو چل اے رشک صبح — شمع کے منہ پر تو پھر گئی مُردنی

اس ستم دیدہ کی صحبت سے جگر لوہو ہے
آپ ہو جائے کہ یہ دل خلۂ پہلو ہے

دہر بھی میر طرفہ مقتل ہے — جو ہے سو کوئی دم کو فیصل ہے
روز کہتے ہیں ملنے کو خوباں — لیکن اب تک تو روز اول ہے

بتاں تو چھوڑ دیتے کر کے خاک راہ کے صدقے
مجھے محفوظ رکھا اپنے میں اللہ کے صدقے
کیا خط لکھوں میں گریہ سے فرصت نہیں رہی
لکھتا ہوں تو پھرے ہے کتابت بہی بہی
ملوں کیونکہ ہم رنگ ہو تجھ سے ظالم
ترا رنگ شعلہ مرا رنگ کاہی

اب خدا مغفرت کرے اس کو — صبر مرحوم تھا عجب کوئی
سبھوں کے خط لیے پوشیدہ قاصد آج جاتا ہے
چلا ہے یار کے کوچہ کو اور مجھ سے چھپاتا ہے

ہو گئی شہر شہر رسوائی — اے مری موت تو بھلی آئی
میر جب سے گیا ہے دل تب سے — میں تو کچھ ہو گیا ہوں سودائی
بارے نسیم ضعف سے کل ہم اسیر بھی — سنا ہٹے میں جیو کے گلستاں تلک گئے

صد کارواں وفا ہے کوئی پوچھتا نہیں
گویا متاع دل کے خریدار مر گئے
تمام اس کے قد میں سناں کی طرح ہے — نکیلی نپٹ اس جواں کی طرح ہے

قطعہ (بند)

اڑے خاک گاہے رہے گاہ ویراں — خراب اور پریشاں یہاں کی طرح ہے
تعلق کرو میر اس پر جو چاہو — مری جان یہ کچھ جہاں کی طرح ہے

آتش کے شعلے سر سے ہمارے گزر گئے
بس اے تپ فراق کہ گرمی میں مر گئے
ناصح نہ رو دیں کیونکہ محبت کے جیو کو ہم
اے خانماں خراب ہمارے تو گھر گئے
ہنگامہ میری نعش پہ تیری گلی میں ہے
لے جائیں گے جنازہ کشاں یہاں سے کب مجھے

قطعہ (بند)

ہجر باعث ہے بدگمانی کا غیرت عشق ہے توکب کل ہے
مر گیا کوہکن اسی غم سے آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے

خنجر بکف وہ جب سے سفاک ہو گیا ہے
ملک ان ستم زدوں کا سب پاک ہو گیا ہے
دیوار کہنہ ہے یہ مت بیٹھ اس کے سائے
اٹھ چل کہ آسماں سب کا واک ہو گیا ہے
زیر فلک بھلا تو رو دے ہے آپ کو میر
کس کس طرح کا عالم یہاں خاک ہو گیا ہے

ساقی گھر چاروں اور آیا ہے دے بھی مے ابر زور آیا ہے
ذوق تیرے وصال کا میرے ننگے سر تا بہ گور آیا ہے

کل ہم سے اس سے بارے ملاقات ہو گئی
دو دو بچن کے ہونے میں ایک بات ہو گئی
کن کن مصیبتوں سے ہوئی صبح شام ہجر
سو زلفیں ہی بناتے اسے رات ہو گئی
گردش نگاہ مست کی موقوف ساقیا
مسجد تو شیخ جیو کی خرابات ہو گئی
کتنا خلاف وعدہ ہوا ہوگا وہ کہ یہاں
نومیدی اور امید مساوات ہو گئی
اپنے تو ہونٹھ بھی نہ ہلے اس کے روبرو
رنجش کی وجہ میر وہ کیا بات ہو گئی

چل قلم غم کی رقم کوئی حکایت کیجے ہر سر حرف پہ فریاد نہایت کیجے
قصد اگر امتحان ہے پیارے اب تلک نیم جان ہے پیارے
سجدہ کرتے ہی سر کٹیں ہیں جہاں سو ترا آستان ہے پیارے

میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے جان ہے تو جہان ہے پیارے

رباعیات

تجھ رہ سے محال ہے اٹھانا مجکو خبطی کہے کوئی کوئی سیانا مجکو
سر میرا لگا ہے نقشِ پا سے تیرے سجدہ کو خدا کے بھی بجانا مجکو

مسجد میں تو شیخ کو خروشاں دیکھا میخانہ میں جوش بادہ نوشاں دیکھا
اک گوشۂ عافیت جہاں میں ہم نے دیکھا سو محلۂ خموشاں دیکھا

کاہے کو کوئی خراب خواری ہوتا کاہے کو کسی پہ جان بھاری ہوتا
دل خواہ ملاپ ہوتا تو ملتے اے کاش کہ عشق اختیاری ہوتا

جگ میں جوں شمع پاؤں جل کر رکھنا یا بن کے بگولا ہاتھ مل کر رکھنا
آیا ہے قمار رخانہ عشق میں تو سربازی ہے یہاں قدم سنبھل کر رکھنا

کیا کریئے بیاں مصیبت اپنی پیارے دن عمر کے میری غم میں گزرے سارے
رنج و ضعف و بلا مصیبت محنت پنپا ہی نہیں توان دکھوں کے مارے

پیغمبر حق نے حق دکھایا اس کا معراج ہے کمترین پایا اس کا
سایہ جو اسے نہ تھا یہ باعث ہے گا کل حشر کو ہوگا سب پہ سایا اس کا

دل تجھ پہ جلے نہ کیونکہ میرا بیتاب یہاں مجکو توقع ہے کہ لاتا ہے جواب
وہاں ان نے شراب پی کے مستی میں میر کر کھائے بھی نامہ بر کبوتر کے کباب

ترقیمہ انجمن

****

"نکات الشعرا" ہندی تمام ہوا۔ یہ تصنیف میر محمد تقی میر تخلص نے حضرت سید عبدالولی صاحب قبلہ عزلت تخلص کی فرمائش پر کی۔ کاتب الحروف ہے سید عبدالنبی ابن سید محمود ابن میر محمد رضا اصفہانی، اللہ ان کی مغفرت کرے، تمام گناہوں کو بخش دے اور ان کے تمام عیوب کی پردہ پوشی کرے اس نیک بنیاد اور ابدالآباد تک رہنے والے شہر میں۔ یہ تحریر ہے تاریخ ۱۱ رمضان المبارک ۱۱۷۲ھ ایک ہزار ایک سو ستّر اور دو، نبی کریم صَلّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلّمْ کی ہجرت سے۔

ترقیمہ پیرس

بتاریخ سترہ ماہِ شوال بروز چہار شنبہ (بدھ) ۱۱۷۸ھ بندرگاہ سورت میں تمام دوستوں کی خواہش پر تکمیل کو پہنچی۔

(عبدالمنّان خوشنویس، ستمبر ۱۹۹۴ء)

ترقیمۂ انجمن

****

"نکات الشعرا" ہندی تمام ہوا۔ یہ تصنیف میر محمد تقی میرؔ تخلص نے حضرت سید عبدالولی صاحب قبلہ عزلتؔ تخلص کی فرمائش پر کی۔ کاتب الحروف ہے سید عبدالنبی ابن سید محمود ابن میر محمد رضا اصفہانی، اللہ ان کی مغفرت کرے، تمام گناہوں کو بخش دے اور ان کے تمام عیوب کی پردہ پوشی کرے اس نیک بنیاد اور ابدالآباد تک رہنے والے شہر میں۔ یہ تحریر ہے تاریخ ۱۱ رمضان المبارک ۱۱۷۲ھ ایک ہزار ایک سو ستّر اور دو، نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ہجرت سے۔

ترقیمۂ پیرس

بتاریخ سترہ ماہ شوال بروز چہار شنبہ (بدھ) ۱۱۷۸ھ بندرگاہ سورت میں تمام دوستوں کی خواہش پر تکمیل کو پہنچی۔

(عبدالمنان خوشنویس، ستمبر ۱۹۹۴ء)

"نکات الشعرا" معلومات کا خزانہ ہے۔ یہ میرؔ صاحب کے عہد جوانی کی ایک یادگار دستاویز ہے۔ میرؔ نے اس میں دو ٹوک [illegible] باتیں بھی کہی ہیں [illegible] اپنے زمانے کے شعرا کی تنقید بھی کی ہے۔ ان کے اشعار میں ترمیمیں اور اصلاحیں بھی کی ہیں انھوں نے جس شعر پر اصلاح کی ہے اس کو بہتر بنادیا ہے بلکہ آسمان پر پہنچا دیا ہے۔

حمیدہ خاتون

"نکات الشعرا" کی اہمیت کئی طرح سے ہے۔ اول تو یہ اردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے اس لیے اس کی تاریخی اہمیت ہے۔ دوم یہ میر تقی میرؔ نے لکھا ہے جو خود عظیم شاعر ہیں، سوم اس میں ڈھائی سو برس قبل کے اردو شعرا کے بڑے شگفتہ اور کامیاب خاکے ہیں، ان کے بہترین اشعار ہیں، چہارم اس میں اردو شاعری کی تنقید کے اولین خد و خال ہیں۔ اس زمانے کے تنقیدی پیمانے ہیں جو اب گم ہو گئے ہیں۔ ان کو سامنے آنا چاہیے۔ پنجم یہ کہ میرؔ کے تنقیدی پیمانے جان کر ہم ان کی شاعری کا بہتر شعور کر سکتے ہیں۔

(اقتباس از مقدمہ مترجم)